آنکھ مچولی
نومبر ۱۹۹۰ء
اس شمارے کے ساتھ جھیل معمے کا
دلچسپ تحفہ مُفت حاصل کیجئے
جناب ایڈیٹر صاحب
ماہنامہ آنکھ مچولی
آپ نے میری کہانی کیوں شائع
نہیں کی میں آپ سے
بہت ناراض ہوں

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں!

ٹپال چائے

دانے دار

لیف بلینڈ

فوری تیار، زیادہ خوشبودار
گہری رنگت، یادگار لذت
ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین

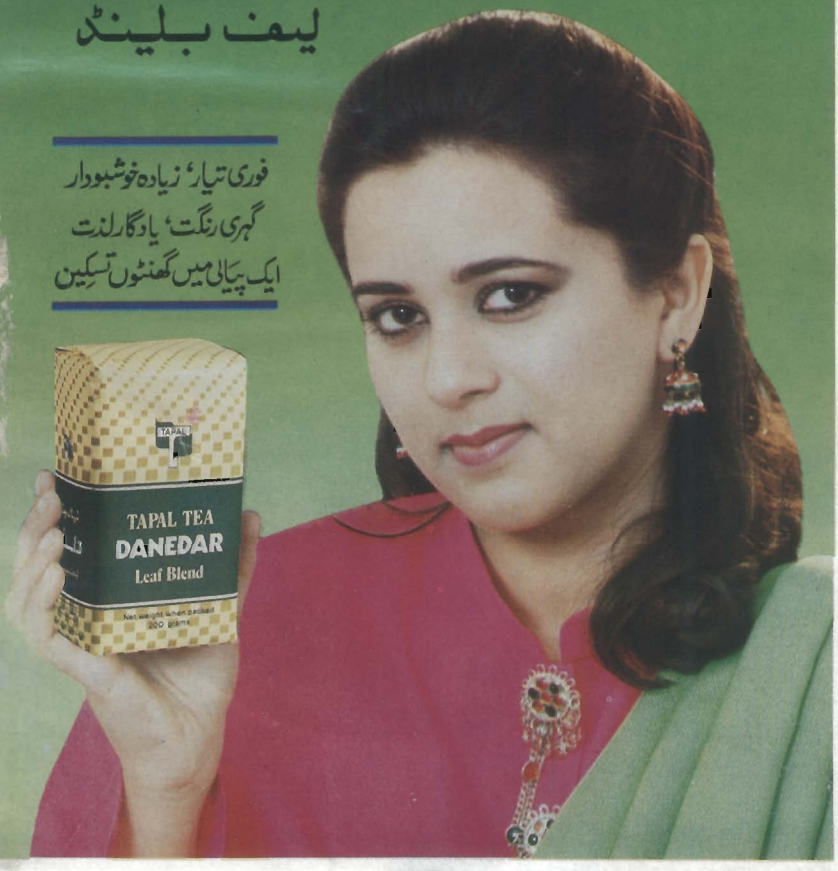

طاقت اور رفتار
موٹرسائیکل
شہسوار
NS 70
دنیا میں پہلی بار
مُفت ایکسیڈنٹ گارنٹی!
★ منظور و مفت انشورنس اور گارنٹی
★ ایک سال کی ذاتی ایکسیڈنٹ انشورنس پالیسی
★ ایک سال کے لئے مفت مرمت / متبادل پرزہ جات کی فراہمی
قیمت 19600 روپے صرف
بکنگ 5000 روپے میں
شہسوار NS 70 موٹرسائیکل
قوت، پائیداری اور معیار میں ۷۰ سی سی کی سواریوں میں سب سے آگے! اس کا طاقتور چار اسٹروک والا انجن ہر کک پر زیادہ قوت فراہم کرتا ہے کسی بھی دشوارگزار سڑک ہو، پائیداری میں اس کا جواب نہیں — اور پھر اس کا سو فیصد اعلیٰ معیار! پٹرول کے خرچ میں انتہائی باکفایت ہونے کے سبب آپ کے ہر پیسے کے خرچ پر زیادہ فاصلے طے کرتی ہے۔ سڑک پر اس کی بہترین گرفت سے آپ کا سفر محفوظ تر! ۳ اسپیڈ والے رواں ٹرانسمیشن کی بدولت ڈرائیونگ کا صحیح لطف! دیکھنے میں جاندار، کارکردگی میں بے مثال شہسوار موٹرسائیکل کا کوئی ثانی نہیں! شہسوار NS 70 کی مناسب دیکھ بھال کے لئے ملک بھر میں سروس سینٹر موجود!
بکنگ کے لئے پاکستان بھر میں منظور شدہ ڈیلرز سے رجوع فرمائیں یا براہِ راست رابطہ قائم کیجئے،
پاکستان کی پہلی مکمل موٹرسائیکل بنانے والے
نارتھ ساؤتھ آٹوموبائلز لمیٹڈ
812/C-2 کمرشیل ایریا۔ پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی۔ فون: 447322
Shahsawar
آپ کی رقم کا بہترین بدل

ORIENT

دالبندین

ایک نئے رابطے کا آغاز

جمعرات، اتوار		دن		جمعرات، اتوار
۱۲۵		پرواز نمبر پی کے		۱۲۶
ایف-۲۷		طیارہ		ایف-۲۷
اکانومی		درجہ		اکانومی
۰۷۴۵	روانگی	کراچی	آمد	۱۸۵۰
۰۹۳۵ ۱۰۰۰	آمد روانگی	تربت	روانگی آمد	۱۷۱۵ ۱۶۵۰
۱۱۲۵ ۱۱۴۵	آمد روانگی	دالبندین	روانگی آمد	۱۵۲۵ ۱۵۰۵
۱۲۰۵	آمد	کوئٹہ	روانگی	۱۳۴۵

پی آئی اے ہفتے میں دو بار آپ کو
کراچی سے دالبندین براستہ تربت
لے جاتی ہے جہاں سے کوئٹہ کے لئے
فوری پرواز بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

مزید تفصیلات کیلئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا قریبی پی آئی اے بکنگ آفس سے رابطہ قائم کیجئے۔

پی آئی اے PIA
پاکستان اِنٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

PID(ISLAMABAD)

IAL-PIA-32-90

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد ۵ شمارہ ۵ ربیع الثانی ۱۴۱۱ نومبر ۱۹۹۰ فون ۲۹۹۱۷۸

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول
تجمل حسین چشتی

مشاورت
مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیر اعزازی
طاہر مسعود محمد سلیم مغل

مجلس ادارت
شاہ نواز فاروقی ساجد سعید منیر احمد راشد

اشتہارات
محمد عرفان

سرکولیشن
ریاض احمد

• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

• ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کیلئے شائع کیا

ناشر ، ظفر محمود شیخ طابع ، زاہد علی مطبع ، لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ ۔ کراچی
خط و کتابت کا پتہ ، ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت
۱۰ روپے ۷ درہم ۷ ریال

حسن ترتیب

۷	حمد	حافظ بشیر آزاد
۹	پہلی بات	(اداریہ)
۱۰	ڈیئر ایڈیٹر	منتخب خطوں کے جواب
۱۳	قیصر و کسریٰ	ترجمہ۔ زبیر طارق
۲۰	علامہ اقبال	طاہر مسعود
۲۵	تحفہ	منیر احمد راشد
۲۹	تکلف اور بے تکلفی	شان الحق حقی
۳۰	اپنی دنیا آپ پیدا کر	سید نذیر زیدی
۳۷	چیونٹیاں	ترجمہ اختر انوار اعوان
۴۲	مجھ سے ملئے (نظم)	روبی کنجاہی
۴۳	ڈنڈا ڈولی	(منتخب لطائف)
۴۷	شاہی دعوت	نیر مسعود
۵۶	دلدل	حمید کاشمیری
۶۸	جہان نو	محمد صالح ارشاد
۷۲	دو مصور	سلمیٰ سلیم
۷۴	بیچارے بچے	شاہنواز فاروقی
۸۱	سورج دادا کا پاجامہ	شاہنواز فاروقی
۸۳	بیمار رہنے کے فائدے	آصف وقار آصف
۸۵	برگد کا درخت	مسعود ذکی
۸۹	کیچوے (فطرت کی دنیا)	شین فاروقی
۹۱	جھوٹی آس	سلیم مغل
۹۷	جاگو جاگو	تبصرہ طاہر مسعود
۹۹	غزل پزل	اسامہ بن سلیم
۱۰۳	سگریٹ اور سنگاپور	(ادارہ)
۱۰۵	ذرا انیتا اونچا کر دینا	انور کلیم بلوچ
۱۲۳	کمسن قلم کار	(منتخب تحریریں)
۱۳۳	روشن مثال	(ذہین ساتھیوں کا تعارف)
۱۳۵	کوپن کا صفحہ	
۱۳۸	امی ابو کا صفحہ	خالد اسماعیل

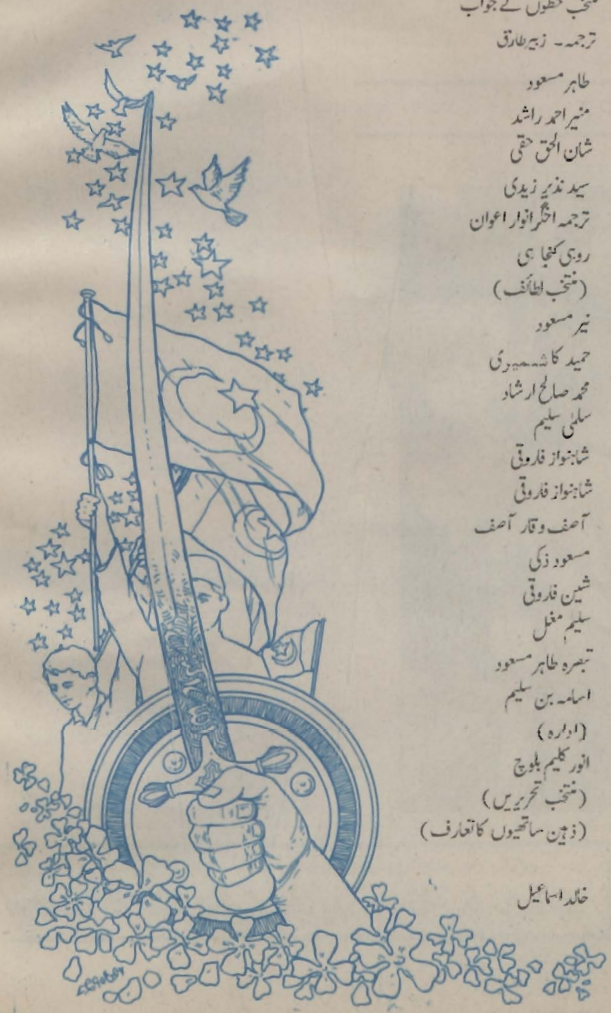

میں اس سے بڑھ کے کروں پیش کیا مثال کوئی
نہیں ہے تیرے سوا ربِّ ذوالجلال کوئی
ترے خیال سے بہتر نہیں ..... خیال کوئی
ترے جمال سے بڑھ کر نہیں جمال کوئی
تو لا شریک ہے ..... تیرا کوئی شریک نہیں
تو بے مثال ہے ..... تیری نہیں مثال کوئی
تری ثنا کا ارادہ کیا تو ربِّ عظیم
ملا نہ لفظ مجھے تیرے حسبِ حال کوئی
میں تیری شان کے اظہار کی تلاش میں ہوں
مرے شعور کے دامن میں لفظ ڈال کوئی
تو اس کی بات کو سنتا، قبول کرتا ہے
خلوص و عجز سے کرتا ہے جب سوال کوئی
جہاں کو لطف و کرم سے نوازنے والے
مرے بھی بخت کا تارہ کبھی اجال کوئی
وہ ذہن دین کی نورانیت سے خالی ہے
کہ جس میں تیرا ابھرتا نہیں خیال کوئی
ہے تیری ذات فقط لم یلد ولم یولد
نہ تو کسی سے ہے پیدا نہ تیری آل کوئی
تو مشرقوں کا بھی رب ہے ..... تو مغربوں کا بھی رب
سمجھ میں آ نہیں سکتا ترا کمال کوئی
جہاں کا سلام ہی آزاد ..... اسم اعظم ہے
جہاں میں بڑھ کے نہیں اس سے نیک فال کوئی

استاد حافظ بشیر آزاد
کوہاٹ

دنیا بھر کے بچّوں کے بارے میں۔

آنکھ مچولی کا خصوصی شمارہ

ان بچّوں کے بارے میں جن کے دم سے ساری رونقیں ہیں، جو دنیا کا مستقبل ہیں۔

مختلف ممالک کے بچّوں کا تعارف، بچّوں کے دلچسپ کھیل، تاریخی شخصیات کا بچپن، بچّوں کے محبوب کردار، غیر معمولی ذہین بچّے، بچّوں کے عالمی ادب سے انتخاب، بچّوں کی عالمی تنظیمیں، تارکین وطن بچّے۔ اور وہ سارے موضوعات جو بچّوں کی دلچسپی کے ہیں۔

ایسی کہانیاں جن میں سارے کردار بچّوں کے ہیں۔

اس ایک دن کی کہانی
جب بچّوں نے دنیا پر اپنی حکومت قائم کر لی
بچّوں کی پریس کانفرنس
ایک دن کے اسکول کی دلچسپ روداد
خوبصورت پیاری نظمیں ..... ان ساری مقبول نظموں کا انتخاب جو اب تک لکھی گئیں۔

اور پھر آپ کو..... تمام ساتھیوں کو مضمون لکھنے کی دعوت :

موضوع "میرے محلے، میرے گاؤں کے بچّے"

آپ اپنے آس پاس بچّوں کو جیسا بھی دیکھتے ہیں، و کھرے انداز میں لکھ بھیجئے تین بہترین مضامین پر انعامات۔

اس اشتہار کو خصوصی شمارے کی بس ایک جھلک سمجھئے۔

ہر تصویر لاجواب، ہر تحریر بے مثال۔

پہلی بات

ایک زمانہ تھا کہ لوگ تعلیم کی اہمیت سے واقف نہیں تھے۔ لہٰذا انہیں یہ بات سمجھانی پڑتی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں کیونکہ تعلیم کے بغیر آدمی باعزت اور خوشحال زندگی نہیں گزار سکتا۔ آج لوگوں کو تعلیم کی اہمیت کا احساس دلانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ایک ان پڑھ شخص بھی یہ بات جان گیا ہے اور وہ اپنی جمع پونجی سے اپنے بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جب لوگ تعلیم کی طرف سے کسی حد تک غافل تھے تو تعلیم کا ایک معیار تھا۔ اور اب جبکہ تعلیم عام ہوتی جارہی ہے تو تعلیم کا معیار گر گیا ہے۔ تعلیم کی جگہ ڈگری اہم ہو چکی ہے۔ والدین کو اس سے دلچسپی نہیں رہی کہ ان کی اولاد نے تعلیمی ادارے سے کیا کچھ سیکھا اور اپنے اندر کتنی اہلیت پیدا کی۔ ان کی دلچسپی فقط اس میں ہے کہ ان کے بچے نے ڈویژن کون سی حاصل کی۔

اس صورتحال پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری حکومتوں نے تعلیم کو کبھی سنجیدہ مسئلہ سمجھا ہی نہیں۔ انہوں نے تعلیم کے فروغ اور اس کے معیار کو بلند کرنے کے لئے کبھی سوچی سمجھی مستقل نوعیت کی تعلیمی پالیسی بنائی ہی نہیں۔ ہر آنے والی نئی حکومت اپنی تعلیمی پالیسی لیکر آتی ہے اور اس پالیسی کو پوری طرح نافذ کئے بغیر رخصت ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک معمولی مثال یہ ہے کہ اب تک یہی طے نہیں ہو سکا ہے کہ بچوں کو ابتدائی جماعتوں میں کس زبان میں تعلیم دی جانی چاہئے۔ حکومتوں کی تعلیم سے لاپروائی دیکھتے ہوئے ان تاجرانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں کی بن آئی ہے جو تعلیم کو صرف ایک کاروبار سمجھتے ہیں۔ شہروں میں نام نہاد انگریزی اسکولوں کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ ہر علاقے میں آپ کو سینٹ میری، سینٹ جیو، آکسفورڈ اور کیمبرج اسکولوں کے بورڈ نظر آتے ہیں اور جب ان کے تعلیمی معیار کا جائزہ لیجئے تو یہ اندر سے کھوکھلے نکلتے ہیں۔ ان اسکولوں میں مختلف حیلے بہانوں سے نہ صرف لمبی لمبی فیسیں اور چندے لئے جاتے ہیں بلکہ ایڈونس اور ڈپازٹ تک لئے جاتے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کے نام پر تعطیلات کے مہینوں میں بھی پورے کرائے وصول کئے جاتے ہیں اور صرف اسی پر بس نہیں کیا جاتا بلکہ کتابیں اور کاپیاں تک انتہائی مہنگے داموں فروخت کی جاتی ہیں۔ اور ان مالی فوائد کے عوض اسکول کی انتظامیہ کی جانب سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہمارے یہاں تمام مضامین کی تعلیم انگریزی زبان میں دی جاتی ہے۔ گویا تعلیم کا مقصد یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ بچے کو انگریزی میں "ہیلو ہائے" کرنا آجائے۔ چلئے اگر ان اسکولوں سے بچوں کو صرف انگریزی زبان بھی آجاتی تو گوارہ تھا۔ رونا تو یہ ہے کہ ان اسکولوں سے نکلنے کے بعد بچوں کو صحت کے ساتھ انگریزی لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا۔ حقیقتاً یہ سب ہمارے احساس کمتری سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں جن کی وجہ سے تعلیم بیچنے والوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اس صورتحال کا تدارک نہ کیا گیا تو مستقبل میں اس کے نتائج ہماری نئی پود اور ملک، ملت کے حق میں نہایت ہولناک نکلیں گے۔ اور تب اصلاح احوال کے لئے بہت دیر ہو چکی ہو گی۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

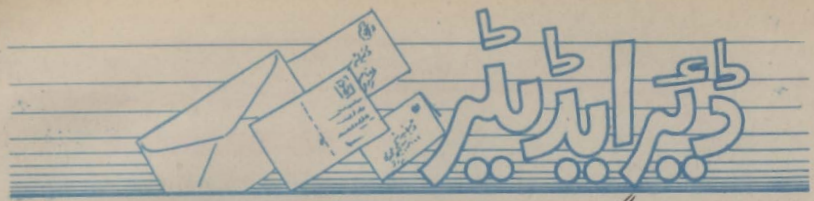

ڈیئر ایڈیٹر

کامران طارق ، گلبہار ...... یہ شکایت ہر ماہ رہتی کہ رسالہ دیر سے ملتا ہے۔ اس بار بھی رسالہ ۸ تاریخ کو ملا۔ مجھے دوسرے رسائل سے یہ ماہنامہ منفرد لگا اس لئے میں نے اسے خریدنا مناسب سمجھا۔

○ ...... رسالے کو خوب تر بنانے میں کبھی کبھار دیر سویر ہو جاتی ہے۔ پھر بھی کوشش یہی رہتی ہے کہ رسالہ آپ کو وقت پر ملے۔ ویسے انتظار کا بھی تو ایک مزہ ہوتا ہے۔

محمد ریاض فیصل ، فیصل آباد ، محمد پرویز آرائیں ، لاہور ...... ستمبر کے شمارے میں بک مارک نہیں ملا۔ حالانکہ آدھا گھنٹہ بک اسٹال والے سے جھگڑا بھی کیا۔ بھائی جان! آپ خاص مہینوں کے حوالے سے بھی سرورق دے دیا کیجئے۔ مثلاً اگست ، ستمبر ، مارچ وغیرہ کے مہینوں میں۔

○ ...... چلئے ستمبر کا بک مارک اکتوبر میں مل گیا۔ ہمیں واقعی بڑی شرمندگی تھی لیکن کیا کیا جائے تحائف عین وقت پر تیار نہ ہو سکے۔ آپ کی تجویز اچھی ہے۔ لیکن آپ بھول گئے کہ اگست میں ہم نے صرف سرورق نہیں بلکہ پورا شمارہ اسی مہینے کی مناسبت سے چھاپا تھا۔

تزئین فرید ، نارتھ ناظم آباد ، کراچی ...... اس بات نے بڑا حوصلہ دیا کہ تعصّب کے اس دور میں آپ بچوں کو پاکستانیت کا درس دے رہے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ آپ کے رسالے میں نظریہ پاکستان سے خاصی لاتعلقی پائی جاتی ہے۔

○ ...... کیا آپ کی دونوں باتوں میں تضاد نہیں؟ آپ کے کئی صفحوں کا خط کئی بار پڑھا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آخر ہمارے رسالے میں نظریہ پاکستان سے لاتعلقی کہاں پر پائی جاتی ہے۔ دل دل پاکستان تو اسی

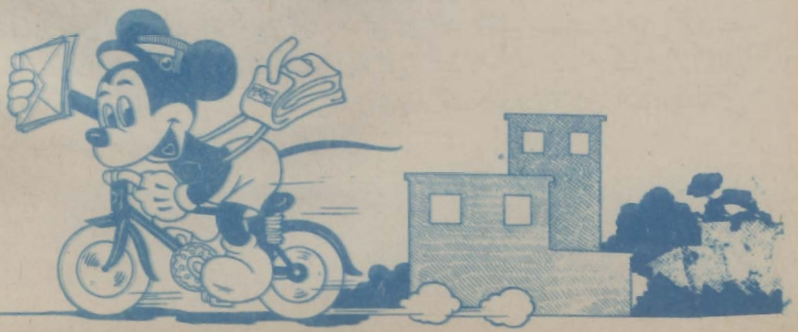

نظریہ کو پھیلانے کے لئے نکالا گیا تھا۔

شبیر احمد ناصر، ماچھکہ ...... آپ نے میرا مضمون تو شائع کر دیا لیکن میرا نام غلط لکھا ہے۔ آپ نے اگلے شمارے میں تصحیح نہ کی تو آئندہ آنکھ مچولی میں نگارشات بھیجنا اور رسالہ خریدنا بند کر دوں گا۔

○ ...... بھائی، ماچھکہ! اچھی بچے غصہ نہیں کرتے۔ اور دیکھئے نا کہ آپ نے اپنے خط میں نہ پتا لکھا ہے اور نہ شہر کا پورا نام لکھا ہے۔ آپ کی کہانی کا معاوضہ ہمارے پاس امانتاً محفوظ ہے۔ پورا پتہ لکھ بھیجئے تاکہ ہم آپ کو معاوضہ بھجوا سکیں۔

فرحین ناظم آباد، کراچی ...... مجھے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا بے حد شوق ہے اگرچہ میں بچی نہیں ہوں مگر بچوں کے رسالے میں شوق سے پڑھتی ہوں کیونکہ دنیا میں سب سے خوبصورت چیز مجھے بچے لگتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ہر مرتبہ اچھی کتابوں کی فہرست شائع کر دیا کریں تاکہ ہم انہیں خرید کر پڑھ سکیں۔

○ ...... بچے تو آنکھ کی ٹھنڈک ہیں، دل کا سرور ہیں، کائنات کی رونق ہیں۔ ہمارا مستقبل ہیں۔ کتابوں کی فہرست والی تجویز مفید تو ہے لیکن ذرا مشکل ہے۔ ہاں اگر مصنفین اپنی کتابیں ہمیں بھیج دیں تو ہمیں شائع کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔

احمد نواز باجوہ، وزیر آباد ...... آپ کا اشتہار "اگر ایسا ہو" سے ہمیں بالکل اتفاق نہیں ہے کیونکہ اس طرح آنکھ مچولی عام سا رسالہ بن جائے گا۔ لہٰذا اس کی قیمت اور معیار برقرار رہنا چاہئے۔

○ ...... یہ تو آپ کی رائے ہے۔ کیا تمام ساتھیوں کی یہی رائے ہے؟

محمد انعام، کیماڑی، کراچی ...... رسالے کے صفحات بڑھانا چاہئیں تو کوئی بات نہیں لیکن کم کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ رنگین صفحات تو رسالے کی پہچان ہیں اگر وہ نہیں رہے تو پھر رسالے کی اہمیت ہی کیا رہ جائے گی۔

○ ...... تو آپ رسالے کی قیمت بڑھنے سے پریشان نہیں ہیں۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔!

ثمرین غفار، پور منڈی ...... آنکھ مچولی سے ہمیں بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ کیونکہ یہ معیاری رسالہ ہے مگر آپ کیا اس کا معیار گرا کے اس کو عام رسالوں کی طرح بور کرنا چاہتے ہیں۔ آخر کیوں۔ کیا آپ کا بجٹ کم ہو گیا ہے یا زیادہ منافع کمانے کے چکر میں ہیں۔

○ ..... بھئی ابھی تو صرف آپ لوگوں سے رائے مانگی گئی ہے۔ ایسا ہونے کب جارہا ہے۔ آپ تو سچ مچ غصہ ہونے لگیں۔

شمائلہ پرویز، فریحہ فیاض، عثمان پرویز، (؟) ..... ہم نے آپ کا رسالہ تحفے کے لئے خریدا تھا لیکن کہانیاں پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ واقعی آنکھ مچولی نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ اور ہاں آپ اس میں جو تبدیلیاں لانا چاہ رہے ہیں، بالکل نہ لائیں اس سے رسالے کا معیار گر جائے گا۔

○ ..... حیرت ہے کہ آپ نے تحفے کے لئے رسالہ خریدا۔ تحفے بازاروں میں کیا کم ملتے ہیں؟

محمد حسن، نارتھ ناظم آباد، کراچی ..... ستمبر کے رسالے میں "میں نے پاکستان بنتے دیکھا" کے عنوان سے چھپنے والی کہانی میں جو خاکہ بنایا گیا ہے اس میں چاند اور ستارے دونوں ہی درست نہیں ہیں۔ کیونکہ ستارے کے چھ کونے ہیں اور یہ ہمارے سب سے بڑے دشمن اسرائیل کے پرچم پر ہے۔ میں نے توجہ دلا دی ہے، آپ چھاپیں یا نہیں چھاپیں۔

○ ..... آنکھ مچولی کی ترقی کا راز اس میں ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کی اصلاح بھی کر لیتے ہیں۔ تنقید کا بُرا نہیں مانتے، بلکہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ آپ نے بالکل صحیح توجہ دلائی ہے۔ ہمارے آرٹسٹ صاحب سے یہ غلطی ہوگئی اور ہم بھی اسے نہ دیکھ سکے۔ ادارہ اپنے پڑھنے والوں سے معذرت خواہ ہے۔

غلام نبی نیّر، لانڈھی، کراچی ..... اگست کے شمارے میں رنگین صفحات کی کل تعداد بیس تھی۔ اور بارہ اشتہار تھے۔ بیس صفحوں میں بارہ صفحوں پر اشتہارات کا مطلب ہوا کہ اشتہار کل ساٹھ فیصد صفحات پر تھے۔ اس کے علاوہ "اسامیاں خالی ہیں" اور "ٹینڈر نوٹس بھی ٹپک پڑے" آنکھ مچولی میں ان کا کیا کام، آخر اشتہارات اتنے کیوں ہوتے ہیں؟

○ ..... میرے خدا! آپ تو پورا حساب کتاب لے کر بیٹھ گئے۔ اب آپ کمیشن تو نہیں مانگیں گے۔ بھائی صاحب! اشتہارات نہیں چھاپیں گے تو تحفے کہاں سے دیں گے؟ لکھنے والوں کو معاوضہ، رنگین کاغذ، انعامی سلسلے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کہاں سے پورا ہوگا۔

فوزیہ فاضل کریم آباد، کراچی ..... "مقابلہ مصوری" کا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ یہ میرا مشغلہ ہے۔ میں نے پہلے بھی مقابلہ مصوری میں حصہ لیا تھا اور "خصوصی انعام" حاصل کیا تھا۔ میرا یہ انعام کون سی سروس سے آپ بھجوا رہے ہیں؟

○ ..... انعام آپ کا حق ہے۔ ضرور ملے گا اور ممکن ہے رسالہ آنے تک انعام آپ تک پہنچ جائے۔

قیصر و کسریٰ

عربی سے ترجمہ —— زبیر طارق

یہ عین ممکن تھا کہ عبداللہ بن ؓ حذافہ کی زندگی بھی اسی طرح گزر جاتی جیسے ان سے پہلے لاکھوں عرب زندگی گذار چکے تھے ..... کہ نہ کوئی ان کو جانتا ہے اور نہ کسی کو ان کا کبھی خیال آیا ہے ..... لیکن اسلام کے طفیل عبداللہ ؓ کو اپنے زمانے کی دو بڑی طاقتوں فارس (ایران) اور روم کے درباروں میں جانے کا موقع ملا اور ان ملاقاتوں میں جو کچھ پیش آیا وہ تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا۔

ہجرت کا چھٹا سال تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چھ ساتھیوں کو خطوط دے کر عرب و عجم کے حکمرانوں کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ آپ ؐ کو اس مہم کی اہمیت کا خوب اندازہ تھا۔ ان پیغام رسانوں کو نہایت نازک کام سونپا جا رہا تھا۔ انہیں وہاں کے حکمرانوں کو اپنا دین چھوڑنے کی دعوت دینا تھی۔ دوسرے الفاظ میں انہیں یہ پیغام دینا تھا کہ وہ اپنی قوت و اقتدار سے دستبردار ہو جائیں اور ایک ایسی قوم کا دین قبول کر لیں جس کا کچھ حصہ کل تک ان کا محکوم تھا۔ پھر یہ لوگ نہ تو ان ممالک کی زبان جانتے تھے اور نہ انہیں یہاں کے بادشاہوں کے مزاج کی کچھ خبر تھی۔ بلاشبہ یہ ایک خطرناک سفر تھا۔ کچھ خبر نہ تھی کہ جانے والے لوٹ کر بھی آئیں گے یا نہیں۔ مگر آپ ؐ کے ساتھی آپ ؐ کا حکم سن کر اس پر خطر مہم پر روانہ ہو گئے۔

عبداللہ ؓ بن حذافہ کے ذمہ نبی علیہ السلام کا پیغام فارس (ایران) کے بادشاہ کسریٰ کو پہنچانا تھا۔

عبداللہ نے بیوی بچوں کو الوداع کہا اور منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ وہ پتھریلی زمینوں اور ریتیلے میدانوں سے گزرتے، تن تنہا چلے جا رہے تھے۔ بس ایک اللہ کی ذات ان کے ساتھ تھی۔ آخر کار وہ منزل مقصود پر پہنچ گئے اور بادشاہ سے ملاقات کی اجازت چاہی۔

کسریٰ کے حکم سے دربار آراستہ و پیراستہ کیا گیا۔ فارس کے تمام بڑے سردار دربار میں پوری شان و شوکت کے ساتھ جمع ہو گئے۔ اور پھر عبداللہ ؓ کو دربار میں داخلے کی اجازت دے دی گئی۔

عبداللہ ؓ بدوؤں کی روایتی سادگی کے ساتھ دربار میں داخل ہوئے۔ ان کے جسم پر موٹے اور

کھردرے کپڑے تھے۔ لیکن ان کا سر بلند تھا اور وہ سینہ تانے ہوئے تھے۔ انہیں اسلام کی بخشی ہوئی عزت و عظمت کا پورا احساس تھا اور ان کے دل میں ایمان کی چنگاری روشن تھی۔

کسریٰ نے اپنے ایک درباری کو اشارہ کیا۔ وہ عبداللہؓ کے ہاتھ سے خط لینے آگے بڑھا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے کسریٰ سے کہا: "نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ یہ مکتوب تمہارے ہاتھ میں دیا جائے۔ میں اللہ کے رسول کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔"

"اسے میرے قریب آنے دو۔" کسریٰ نے اپنے درباریوں سے کہا۔ چنانچہ عبداللہؓ کسریٰ کے قریب گئے اور نامہ مبارک اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔ کسریٰ نے اپنے عرب سیکریٹری کو بلوایا اور اسے خط پڑھنے کو کہا اس میں تحریر تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کے رسول محمدؐ کی جانب سے فارس کے کسریٰ کے نام۔ اس کے لئے سلامتی ہے جس نے ہدایت کی پیروی کی....."

اتنا سنتے ہی کسریٰ غیظ و غضب سے بھڑک اٹھا اس کی وجہ یہ تھی اللہ کے رسولؐ نے خط میں اپنا نام پہلے لکھا تھا..... اس نے سیکریٹری کے ہاتھ سے خط چھینا اور یہ جانے بغیر کہ اس میں کیا تحریر ہے، پھاڑ ڈالا۔ وہ تکبر سے چیخ رہا تھا: "میرا غلام ہو کر اس طرح لکھتا ہے"؟ پھر اس نے عبداللہؓ بن حذافہ کو حکم دیا "میرے دربار سے نکل جاؤ۔" وہ خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

عبداللہؓ کسریٰ کے دربار سے باہر نکل آئے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے..... انہیں قتل کیا جائے گا یا آزاد چھوڑ دیا جائے گا؟ انہوں نے بس اتنا کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب کو جس طرح پھاڑا گیا ہے اور مجھے اذیت دی گئی ہے۔ اب کچھ پرواہ نہیں کہ مجھ پر کیا گذرتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی سواری پر بیٹھے اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔

ادھر کسریٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے حکم دیا کہ عبداللہؓ کو اس کے پاس لایا جائے چنانچہ انہیں تلاش کیا گیا مگر وہ کہیں نہ ملے۔ پھر انہیں جزیرہ عرب کے راستے میں ڈھونڈا گیا۔ یہاں تلاش کے دوران انہیں علم ہوا کہ عبداللہ واپس جا چکے ہیں۔

عبداللہ بن حذافہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسریٰ کے دربار میں جو کچھ پیش آیا تھا، گوش گذار کیا۔ نبی علیہ السلام نے سارا واقعہ سن کر صرف اتنا فرمایا "اللہ اس کی سلطنت اسی طرح پارہ پارہ کر دے گا۔"

ادھر کسریٰ نے یمن میں اپنے نائب باذان کو فرمان بنا کر بھیجا "حجاز میں جو شخص اٹھا ہے، اپنے دو قوی آدمی اس کی جانب بھیجو اور انہیں حکم دو کہ وہ اس شخص کو میرے پاس لائیں۔"

چنانچہ باذان نے اپنے دو بہترین آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب روانہ کئے اور انہیں ایک خط دیا۔ اس میں تحریر تھا کہ "وہ کسریٰ سے ملاقات کے لئے ان آدمیوں کے ہمراہ آئیں اور اس سلسلے میں کوئی سستی نہ برتیں۔"

باذان نے اپنے آدمیوں کے ذمے ایک اور کام بھی سپرد کیا۔ اس نے ہدایت کی کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے کی تحقیق کریں اور ان کے متعلق تمام معلومات لے کر آئیں۔

ان افراد نے بڑی تیزی سے منزلیں طے کیں اور طائف جا پہنچے۔ یہاں ان کی ملاقات قریش کے چند تاجروں سے ہوئی۔ انہوں نے ان تاجروں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا "وہ یثرب میں ہیں۔" اس کے بعد یہ تاجر خوش خوش مکہ پہنچے اور قریش کو مبارکباد دی۔

"خوش ہو جاؤ۔ تمہارے لئے ایک اچھی خبر ہے۔ کسریٰ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درپے ہو گیا ہے۔ اب وہ تمہیں اس کے شر سے بچا لے گا۔"

طائف سے وہ دونوں شخص سیدھے مدینہ منورہ جا پہنچے اور نبی علیہ السلام سے ملاقات کی۔ انہیں باذان کا خط دیا اور کسریٰ کے قہر سے ڈرانے کی کوشش کی۔

ان کی یاوہ گوئی سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا "اب تم لوگ اپنی قیام گاہ پر جاؤ اور کل صبح آنا۔"

اگلے دن وہ صبح سویرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور کہا "رات بھر آپ نے سوچ بچار کی ہوگی۔ کیا آپ ملاقات کے لئے ہمارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہیں۔؟"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کسریٰ اب کبھی نہ مل پائے گا..... اللہ تعالیٰ نے اس کا کام تمام کر ڈالا ہے۔ اس کے بیٹے شیرویہ نے فلاں مہینے کی رات کو اسے قتل کر دیا ہے۔"

یہ سننا تھا کہ ان کی آنکھیں پھٹ گئیں اور ان کے چہرے پر خوف اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات پھیل گئے۔ وہ بولے "آپ جانتے ہیں کہ، کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا ہم باذان کو یہ لکھ بھیجیں؟" آپؐ نے فرمایا ہاں..... اور اس سے کہنا ایک دن میرا دین کسریٰ کی سلطنت تک پہنچے گا۔ اگر تم اسلام قبول کر لو میں تمہارا علاقہ تمہیں سونپ دوں گا اور تمہیں تمہاری قوم کا حاکم بنا دوں گا۔"

یہ دونوں آدمی واپس پہنچے اور باذان کو سارے معاملے سے آگاہ کیا۔ وہ بولا "جو کچھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا ہے، سچ ہے تو وہ یقیناً نبی ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو دیکھتے ہیں کیا کرنا چاہئے۔"

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ باذان کو شیرویہ کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا۔

"میں نے کسریٰ کو قتل کر ڈالا ہے۔ مجھے یہ قدم اپنی قوم کا انتقام لینے کے لئے اٹھانا پڑا کیونکہ اس نے شرفاء کو قتل کرنا، ان کی عورتوں کو قید کرنا اور ان کا مال لوٹنا حلال ٹھہرالیا تھا۔ جیسے ہی تمہیں میرا خط ملے، میری اطاعت قبول کرلو۔"

باذان نے شیرویہ کا یہ خط پڑھا اور اسے ایک جانب پھینک دیا پھر اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی یمن کے علاقے میں مقیم تمام فارسی مسلمان ہوگئے۔

یہ تھا عبداللہؓ حذافہ کا فارس کے بادشاہ کسریٰ سے ملاقات کا قصہ۔ اب روم کے شہنشاہ قیصر سے ملاقات کا قصہ سنئے

ہجرت کا انیسواں سال تھا۔ عمرؓ نے رومیوں سے جنگ کے لئے ایک لشکر بھیجا۔ اس لشکر میں عبداللہ بن حذافہؓ بھی شامل تھے۔

قیصر روم کو مسلمان فوجیوں کے بارے میں عجیب و غریب اطلاعات مل رہی تھی۔ مسلمان اپنے ایمان میں بڑے سچے اور مخلص ہیں، عقیدہ ان کے دلوں میں گھر کرچکا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جانوں کو قربان اور نچھاور کرنے پر ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کی بیسیوں باتیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔

قیصر نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ جیسے ہی مسلمان قیدی ان کے ہاتھ لگیں، انہیں زندہ اس کے پاس لایا جائے..... "اللہ کی مرضی..... عبداللہ بن حذافہؓ دشمن کے ہاتھوں قید ہوگئے۔ رومی سپاہی انہیں اپنے بادشاہ کے پاس لائے اور کہا "یہ شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ابتدائی ساتھیوں میں سے ایک ہے اور ہم نے اسے گرفتار کیا ہے۔"

قیصر، رومی شہنشاہ عبداللہؓ کو دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"میں تمہارے سامنے ایک تجویز رکھتا ہوں۔"

"وہ کیا؟" عبداللہؓ نے پوچھا۔

"تم عیسائی ہوجاؤ..... میں تمہیں آزاد کردوں گا اور اپنا معزز مہمان ٹھہراؤں گا۔"

قیصر کی یہ پیشکش سن کر عبداللہؓ نے بڑے فخر اور عزم سے کہا "افسوس ہے تجھ پر..... موت مجھے اسی کام سے ہزار درجہ زیادہ پسند ہے۔"

"تم مجھے نہایت ذہین آدمی دکھائی دیتے ہو..... اگر تم میری بات مان لو تو میں تمہیں اپنے اقتدار میں حصہ دار بنانے کو تیار ہوں۔" قیصر نے ان پر ایک نیا جال پھینکا۔

بیڑیوں میں جکڑا قیدی مسکرایا "بخدا اگر تم مجھے اپنی سلطنت اور پورا عرب دے ڈالو اور کہو کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے رتی برابر ہٹ جاؤں، تو بھی یہ منظور نہیں۔" عبداللہ نے کہا۔

"میں تمہیں قتل کر ڈالوں گا۔" قیصر نے انہیں ڈرایا۔

"جو چاہو کرو۔" عبداللہؓ بن حذافہ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

قیصر نے حکم دیا اور انہیں سولی پر لٹکا دیا گیا۔ پھر اس نے اپنے تیر اندازوں کو حکم دیا۔ "اس کے ہاتھوں کے قریب تیر مارو۔" تیر اندازوں نے حکم کی تعمیل کی۔ قیصر نے اپنا مطالبہ دہرایا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

اب قیصر نے تیر اندازوں کو عبداللہؓ کی ٹانگوں کے قریب تیر مارنے کا حکم دیا اور انہیں اپنا دین چھوڑنے کی دوبارہ دعوت دی۔ مگر عبداللہؓ کا جواب انکار میں ہی تھا۔

قیصر نے تیر اندازوں کو ہاتھ روک لینے کا حکم دیا اور کہا کہ انہیں صلیب سے اتار لیا جائے۔ پھر اس کے حکم سے ایک بڑی دیگ منگوائی گئی۔ اسے تیل سے بھر کر آگ پر چڑھا دیا گیا۔ جلد ہی تیل کھولنے گا۔ پھر اس نے مسلمان قیدیوں میں سے دو افراد کو لانے کو کہا۔ قیصر کے اشارے پر ایک قیدی کو اس کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا گیا۔

درندگی کے اس مظاہرہ کے بعد وہ دوبارہ عبداللہؓ کی جانب متوجہ ہوا اور انہیں عیسائی ہونے کو کہا۔ حضرت عبداللہؓ نے اس مرتبہ سختی سے انکار کر دیا۔

قیصر اب بالکل ناامید ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ انہیں بھی ان کے ساتھی کی طرح دیگ میں ڈال دیا جائے۔ جب جلاد انہیں لے جانے لگے تو ان کی آنکھیں بھر آئیں..... بادشاہ کے آدمیوں نے فوراً اطلاع دی "قیدی رو رہا ہے۔"

قیصر سمجھا کہ وہ ڈر گئے ہیں۔ اس نے انہیں واپس لانے کا حکم دیا اور انہیں دوبارہ عیسائی ہونے کی دعوت دی۔ مگر عبداللہؓ کا جواب بدستور انکار تھا۔

"تیرا بُرا ہو، پھر تو رویا کیوں تھا؟" قیصر نے جھنجھلا کر کہا۔

میری آنکھیں اس لئے بھر آئیں کہ میں نے اپنے آپ سے کہا "اب تجھے اس دیگ میں ڈال دیا جائے گا اور تیری جان نکل جائے گی۔" حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ میری اتنی جانیں ہوتیں جتنے میرے جسم پر بال ہیں اور میں ان سب کو اللہ کی راہ میں اس دیگ کے اندر ڈال دیتا۔" حضرت عبداللہ نے ایمان کے ولولے اور جوش سے کہا۔

"کیا ممکن ہے کہ تو میرے سر پر بوسہ دے، اور میں تجھے چھوڑ دوں۔" قیصر نے پوچھا۔

"اور تمام مسلمان قیدی بھی۔" عبداللہؓ نے کہا۔

"ہاں تمام مسلمانوں قیدی بھی۔" قیصر نے جواب دیا۔

"عبداللہؓ کہتے ہیں "میں نے اپنے دل میں کہا۔ اگرچہ یہ شخص اللہ کا دشمن ہے، تاہم اس کے سر پر بوسہ دینے سے نہ صرف میں چھوٹ جاؤں گا بلکہ تمام مسلمان قیدی بھی رہا ہو جائیں گے۔ اس لئے ایسا کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔"

چنانچہ عبداللہؓ آگے بڑھ کر قیصر کے قریب پہنچے اور اس کا سر چوم لیا۔ شہنشاہ روم نے حکم دیا کہ عبداللہ اور اس کے ساتھی مسلمان قیدی رہا کر دیئے جائیں۔

حضرت عبداللہؓ بن حذافہؓ امیر المومنین عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں سارا واقعہ سنا دیا۔ یہ قصہ سن کر آپ بہت خوش ہوئے۔ پھر ان کی نظر مسلمان قیدیوں پر پڑی۔ تو فرمایا "ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ عبداللہ کا سر چومے۔ اور میں پہل کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر آپ اٹھے اور ان کے سر کا بوسہ لیا۔

اُردو

- ..... اردو کے پہلے شاعر کا نام امیر خسرو تھا۔
- ..... اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد تھے۔
- ..... اردو لکھو، اردو پڑھو، اردو بولو، خواجہ حسن نظامی کا قول ہے۔
- ..... اردو میں جاسوسی ناول سب سے پہلے ظفر عمر زبیری نے لکھا تھا۔
- ..... اردو میں ناول نگاری کا آغاز ۱۸۴۹ء میں ہوا۔
- ..... اردو کا عمر خیام ریاض خیر آبادی کو کہا جاتا ہے۔
- ..... اردو کے مشہور ادیب مولانا ابوالکلام آزاد، مکہ میں پیدا ہوئے۔
- ..... اردو کے مشہور شاعر مومن خان مومن چھت سے گر کر فوت ہوئے تھے۔
- ..... اردو کے سب سے بڑے جاسوسی ناول نگار ابن صفی تھے۔

(مرسلہ :۔ راشد آدم بلوچ ..... وندر)

یہ اِک پَل میں کیا ماجرا ہوگیا

کتنی نقلی ہے یہ ہریالی نہ پوچھ

حارث فاروقی

بچپن میں جب ہم یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہوگیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہوگیا

تو بڑے حیران ہوا کرتے تھے کہ دو دن میں سوکھا ہوا جنگل ہرا بھرا کیسے ہوسکتا ہے، مگر اب ہم نے گھاس ڈائی کرنے والے طریقے کے بارے میں پڑھا تو ہمیں یقین آگیا کہ جنگل دو دن میں کیا ایک دن میں ہرا ہوسکتا ہے۔ اس طریقے میں ایک ہرے محلول کے ذریعے پیلی گھاس کو ہری بھری گھاس میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح ایک پیلا لان دیکھتے ہی دیکھتے ہرے بھرے لان میں تبدیل ہوگیا۔ اس طریقے سے ایک ہزار اسکوائر فٹ پیلی گھاس کو ہری گھاس میں تبدیل کرنے پر ایک ہزار نو سو پچپن روپے صرف ہوتے ہیں۔ سائنس کی ترقی کی مثال زیر زمین کار پارکنگ کا نظام ہے۔ اس نظام میں زمین پر کھڑی ہوئی کار لفٹ کے ذریعہ پلک جھپکتے میں نیچے چلی جاتی ہے اور پلک جھپکتے میں اوپر آجاتی ہے۔ یہ نظام ریموٹ کنٹرول کے ذریعے کام کرتا ہے۔ یہ نظام بڑا مہنگا ہے۔ یعنی صرف ۵ لاکھ ۵ ہزار روپے کا۔ مطلب یہ کہ یہ نظام ابھی تک امیروں کے چونچلے سے زیادہ کچھ نہیں۔

بے موسم ہریالی

دیکھتے ہی دیکھتے دھرتی نگل جاتی ہے کار

علامہ اقبال

طاہر مسعود

کا بچپن

سیالکوٹ کے ایک نیک دل اور دیندار شخص شیخ نور محمد نے ایک رات خواب دیکھا۔ "ایک بہت وسیع میدان ہے جس میں بے شمار لوگ فضا میں اڑتے ہوئے ایک سفید کبوتر کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کبوتر کبھی نیچے اترتا اور کبھی آسمان کی طرف اڑ جاتا ہے۔ بالآخر اس نے اچانک فضا میں غوطہ لگایا اور شیخ نور محمد کی جھولی میں آگرا۔"

شیخ نور محمد جب بیدار ہوئے تو دیر تک اس خواب کے بارے میں سوچتے رہے۔ انہیں تصوف سے گہرا لگاؤ تھا بلکہ وہ خود ایک صوفی تھے۔ اور بہت سی ایسی باتوں سے واقف تھے جنہیں عام لوگ نہیں جانتے۔ اس خواب کی تعبیر انہوں نے یہ نکالی کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا جو اسلام کی خدمت کی وجہ سے مشہور ہوگا۔ خواب دیکھنے کے بہت دن بعد، ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو واقعتاً ان کے گھر ایک سرخ و سپید پیارے سے بچے نے جنم لیا۔ شیخ نور محمد کو اپنا خواب یاد تھا۔ انہوں نے بچے کا نام رکھا "اقبال" رکھا جس کے معنی اعتراف اور تسلیم کے ہوتے ہیں۔ اور تب کسے معلوم تھا کہ وہ وقت بھی آئے گا جب اس نو مولود بچے کی شاعرانہ عظمت کو ایک دنیا تسلیم کرلے گی اور ہر سال اس کی خدمات کے اعتراف میں اسے خراج تحسین پیش کیا کرے گی۔

اقبال بچپن ہی سے بے حد ذہین اور ہوشیار تھے۔ وہ عام بچوں سے مختلف بھی تھے۔ چار سال کے ہوئے تو والد نے مدرسے کے مکتب میں قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بٹھا دیا۔ جہاں انہوں نے تقریباً سال بھر قرآن مجید پڑھا۔ ایک دن وہ درس گاہ میں بیٹھے اپنا سبق یاد کر رہے تھے کہ ایک بزرگ وہاں تشریف لائے۔ انہوں نے اقبال پر نظر ڈالی تو ان کی سنجیدہ شکل و صورت اور بھورے بالوں سے بہت متاثر ہوئے۔ پوچھا: "یہ بچہ کس کا ہے؟"

استاد نے بتایا: "شیخ نور محمد کا۔"

بزرگ یہ سن کر چلے گئے۔ یہ بزرگ سیّد میر حسن تھے۔ اپنے زمانے کے نہایت عالم فاضل۔ مولوی میر حسن بعد میں اقبال کے والد سے ملے۔ اور انہیں سمجھایا کہ ان کا بچہ بہت غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس لئے اسے صرف دینی تعلیم دلانا کافی نہیں ہے۔ اس کی صلاحیتیں اسی صورت میں نکھر سکتی ہیں جب اسے جدید تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ کیا جائے۔

والد نے پوچھا: "اس کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

مولوی میر حسن نے کہا: "اس بچے کو آپ میری شاگردی میں دے دیجئے۔"

شیخ نور محمد نے سوچ بچار کے بعد اقبال کو مکتب سے اٹھا کر مولوی میر حسن کے حوالے کر دیا۔ جنہوں نے اقبال کو فارسی اور عربی ادب پڑھانا شروع کیا۔ اقبال ذہین تو تھے ہی۔ ایک قابل استاد ملا تو تعلیم میں ان کی دلچسپی بڑھ گئی۔ میر حسن ان پر خاص توجہ کرتے تھے۔ وہ تین سال تک اقبال کو ادبیات کی تعلیم دیتے رہے۔

اس زمانے میں مسلمانوں میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا رواج نہیں تھا۔ اور اکثر گھرانوں میں انگریزی تعلیم کو بُری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ انگریزی تعلیم مسلمانوں کو دین سے بے گانہ کر دے گی۔ میر حسن نے انہی دنوں اسکاچ مشن اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اور ساتھ ہی اقبال کے والد کو بھی اس بات پر تیار کر لیا کہ وہ اقبال کو اس اسکول میں داخلہ دلا دیں۔ اقبال کا داخلہ اسکول میں ہو گیا۔ لیکن وہ اسکول کے بعد بھی اپنے لائق استاد سے پڑھا کرتے تھے۔ ان کے استاد کے پڑھانے کا دلچسپ طریقہ یہ تھا کہ جب بھی وہ سودا سلف لینے بازار جاتے یا صبح سویرے قبرستان میں فاتحہ پڑھنے جاتے تو ان کے شاگرد ساتھ ہو لیتے اور راستے میں وہ انہیں مختلف مضامین کی تعلیم دیتے جاتے۔ مولوی میر حسن کے پڑھانے کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ طالب علم میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی پیاس بڑھ جاتی تھی۔ انہیں عربی، فارسی اور پنجابی کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ اقبال بعد میں جب ایک بڑے آدمی بن گئے تو انہوں نے

تسلیم کیا کہ انہیں جوہر قابل بنانے میں مولوی میر حسن کا سب سے نمایاں حصہ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ جب اقبال کو ان کی علمی اور شعری خدمات کے حوالے سے انگریزی حکومت نے "سر" کا خطاب دینا چاہا تو اقبال نے یہ شرط عائد کر دی کہ جب تک ان کے استاد سید میر حسن کی علمی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جائے گا وہ یہ خطاب قبول نہیں کریں گے۔

حکومت نے پوچھا: "کیا سید میر حسن کی کچھ تصانیف ہیں؟"

"میں خود ان کی تصنیف ہوں" اقبال نے جواب دیا۔ چنانچہ پہلے سیّد میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔

سید میر حسن نے اقبال کو عربی، فارسی اور اردو ادب، علم و حکمت اور تصوف وغیرہ کی تعلیم دی اور ایسی تعلیم دی کہ ان کے دل میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی جستجو بڑھ گئی۔ اقبال ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان ہی دنوں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ میر حسن اپنے ایک رشتہ دار بچے کو لے کر گھر سے نکلے۔ بچے کا نام احسان تھا۔ اقبال ہمراہ تھے۔ مولوی صاحب نے بچے کو اقبال کی گود میں دے دیا۔ اقبال اسے گود میں اٹھا کر چلتے تو رہے لیکن تھوڑی دور پر تھک کر بیٹھ جاتے تھے۔ مولوی صاحب بے خیالی میں آگے بڑھتے گئے۔ ذرا آگے جا کر انہیں احساس ہوا کہ اقبال ساتھ نہیں ہے تو پلٹ کر آئے اور اقبال سے کہا:

اس کی برداشت بھی دشواری ہے؟

اقبال نے برجستہ کہا:

تیرا احسان بہت بھاری ہے

ننھے اقبال کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ ان کی آواز بھی نہایت شیریں تھی۔ وہ بازار سے منظوم قصے خرید کر لاتے تھے اور گھر کی عورتوں کو ترنم سے پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ وہ رات گئے تک پڑھتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ آدھی رات کو ان کی والدہ کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ اقبال بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے دو تین بار پکارا۔ لیکن کوئی جواب نہ پایا۔ اقبال لیمپ کے پاس پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ انہیں کھیل کود سے بھی دلچسپی تھی۔ کبوتر پالنے، پتنگ اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا انہیں بے حد شوق تھا۔ ان کے پاس بہت سے خوبصورت کبوتر تھے۔ والد نے اسی خیال سے انہیں گھر پر کبوتر رکھنے کی اجازت دے دی تھی کہ اس شوق میں وہ باہر جا کر خراب صحبت نہ اختیار کر لیں۔ یہ شوق انہیں بعد میں بھی رہا۔ وہ کبوتروں کو ڈربے سے نکال کر چھوڑ

دیتے اور جب وہ فضا میں پرواز کرنے لگتے تو محویت سے انہیں دیکھتے رہتے۔

اقبال بچپن میں روزانہ صبح قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ ایک دن والد نے شفقت سے فرمایا: "بیٹا تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی نازل ہوا ہے۔" یعنی خدا خود تم ہی سے ہم کلام ہے۔ اقبال کو والد کی یہ نصیحت ساری زندگی یاد رہی۔ قرآن پڑھتے ہوئے ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ رخسار آنسوؤں سے تر ہو جاتے تھے۔ ان کی شاعری پر قرآنی تعلیمات کا گہرا اثر نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ اقبال نے بعد میں اس واقعہ کو اپنے ایک شعر میں بھی بیان کیا:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہیں نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

مطلب یہ کہ تمہارے خیالات کی الجھنوں کو کوئی بڑے سے بڑا فلسفی اور حکیم نہیں سلجھا سکتا جب تک کہ تم اللہ کی کتاب کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس نہ کرو۔

ایک روز والد بزرگوار نے اقبال سے کہا: "میں نے تمہیں پڑھانے لکھانے میں جو محنت صرف کی ہے۔ میں تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔"

اقبال نے بڑے شوق سے پوچھا: "وہ کیا ہے؟"

والد نے جواب دیا: "بیٹا! میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا۔"

بعد میں اقبال کی شاعری کا چرچا عام ہوا اور انہوں نے اپنے شعروں سے لوگوں میں اسلامی جوش و ولولہ پیدا کرنا شروع کیا تو انہی دنوں وہ اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ والد بیمار تھے اور بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔

اقبال نے کہا: "ابا جان! میں نے آپ سے اسلام کی خدمت کرنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں۔"

والد نے کمزور آواز میں شہادت دی۔ "بیٹا! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا۔"

اقبال نویں جماعت میں پہنچے تو ان کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ شاعری تو انہیں شروع ہی سے لگ گئی تھا۔ بچپن میں اکثر ایسے فقرے بول جاتے تھے جو بحر یا وزن میں ہوتے تھے۔ اسکول میں اکثر چھوٹی چھوٹی غزلیں کہا کرتے تھے اور پھر ان کو پھاڑ کر پھینک دیا کرتے تھے۔ اقبال نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ انہیں تمغہ اور وظیفہ بھی ملا۔ ایف اے کے لئے انہوں نے اسکاچ مشن اسکول میں داخلہ لیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں ان کی غزلیں دہلی کے

رسالوں میں چھپنے لگی تھیں۔ جس کے بعد انہوں نے اردو کے مشہور شاعر داغ دھلوی سے اصلاح لینی شروع کی۔ لیکن ابھی ان کی شاعری محض ایک کلی تھی، پھول نہ بن سکی تھی۔

ایف اے کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور کا رخ کرنا پڑا۔ والد شیخ نور محمد کاروبار چھوڑ چکے تھے اس لئے ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ چچا شیخ عطا محمد نے ان کے تعلیمی اخراجات برداشت کیے ورنہ اقبال کی تعلیم کا سلسلہ وہیں ختم ہو جاتا۔

اقبال ستمبر ۱۸۹۵ء میں لاہور پہنچے اور انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔

کالج میں انہیں باذوق دوست اور سب سے بڑھ کر پروفیسر آرنلڈ جیسا استاد ملا۔ جن کی رہنمائی میں انہوں نے فلسفہ اور دیگر علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ پروفیسر آرنلڈ خود بھی اقبال سے بہت متاثر تھے اور کہا کرتے تھے کہ "اقبال جیسا طالب علم استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔" جب آرنلڈ ملازمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان چلے گئے تو اقبال علمی تحقیق کی جستجو میں اور آرنلڈ کی قربت حاصل کرنے کے لئے انگلستان جانے پر مجبور ہوگئے۔ مولوی میر حسن نے اقبال کو مشرقی ادبیات و علوم سے واقف کرایا تھا تو آرنلڈ نے انہیں مغربی فلسفے کی آگاہی دی تھی۔ انہی دونوں علوم کے ملاپ اور قرآنی تعلیم کے فیض سے اقبال کی شاعری چمک اٹھی اور اس نے ایک جہان کو روشن کیا۔

بن بلائے آگیا کیک ہمارا کھا گیا

تحفہ

منیر احمد راشد

"ریحانہ! قیمہ پس گیا ہے کیا؟" امی نے چاول بینتے ہوئے گردن اٹھائے بغیر پوچھا۔

"جی امی جان! قیمہ تو پس چکا ہے۔ اب تو مصالحہ پیس رہی ہوں۔" باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی ریحانہ نے آنکھوں پر آجانے والی بالوں کی لٹ کو کندھے کی مدد سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا اور دوبارہ مصالحہ پیسنے میں مصروف ہوگئی۔

"بھئی ذرا جلدی کرلو، شبو آتا ہی ہوگا۔" امی نے اُسی انداز میں کہا۔ "تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ وہ بھوک کا بہت کچا ہے۔ ذرا دیر ہوگئی تو گھر بھر کو سر پر اٹھالے گا چیخ چیخ کر۔" انہوں نے چاولوں کا تسلہ گھٹنوں پر سے اٹھا کر ایک طرف رکھا اور ذرا جھک کر پلنگ کے نیچے اپنی چپل تلاش کرنے لگیں۔ جوتیاں پہن کر انہوں نے تسلہ اٹھایا اور باورچی خانے کا رخ کیا، جہاں پسینے میں شرابور ریحانہ بڑی محنت سے سِل کے اوپر مصالحہ پیسنے میں مصروف تھی۔

"لو بھئی یہ تو رکھو اِدھر، ذرا کھیر کا سامان ٹھیک کرلوں۔" امی جان نے چاولوں سے بھرا ہوا تسلہ باورچی خانے میں ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر خشک میووں کی بڑی سے پُڑیا وہاں سے اٹھا کر واپس اپنے پلنگ پر آبیٹھیں۔

آج شبو آرہا تھا..... شبو..... جو ڈاکٹر شہاب بن چکا تھا، اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس گھر آرہا

تھا اور کھانے کا یہ سب اہتمام اسی کے لئے تھا۔ وہ کوفتے بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ کھیر بھی اس کی پسندیدہ ڈش تھی۔ اسی لئے ماں نے بڑے لاڈ سے یہ دونوں چیزیں اس کے لئے تیار کی تھیں۔

سلطان صاحب کی وفات کے بعد انہوں نے بڑی محنت اور محبت سے اولاد کی پرورش کی تھی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ اسی لئے ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھتی تھیں۔ کشمیری ہونے کے حوالے سے بھی جفاکشی کا جوہر اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھا..... شہاب پانچویں جماعت کا طالب علم تھا جب اسے یتیمی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ لیکن ماں نے اسے کبھی باپ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ ریحانہ اس وقت چھوٹی تھی اور گڈو نے تو اچھی طرح پاؤں چلنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ بیوگی کا الم ناک احساس ایک ناگ کی مانند ڈستا تھا۔ مستقبل کے انجانے مسائل عفریت کی طرح منہ کھولے کھڑے تھے۔ کوئی مادی سہارا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ بس اللہ کا آسرا تھا یا قوتِ بازو پر بھروسہ۔ پھر اگر کچھ کر گذرنے کا جذبہ موجود ہو تو مشکلات خود رستہ دیتی ہیں۔ مسائل حل ہوتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر منزل خود آگے بڑھ کر قدم چوم لیتی ہے۔

بارہ برس پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ بظاہر بے سہارا نظر آنے والا یہ خاندان ایک بار پھر معاشرے میں اپنا مقام بنالے گا۔ ایک باپردہ خاتون کہ جو کبھی گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلی، تین یتیم بچوں کی پرورش کرے گی کیسا ناممکن نظر آتا تھا! لیکن آج چشم فلک نے یہ نظارہ دیکھا کہ ایک یتیم اور بے سہارا شبو، ڈاکٹر شہاب کے روپ میں نمودار ہو رہا تھا۔ ریحانہ میٹرک کر چکی تھی اور گڈو ساتویں جماعت میں تھی۔ یقیناً اس کامیابی کے پیچھے اس خاتون کی بے مثل اور انتھک محنت کار فرما تھی۔ جس نے نہ صرف بیوگی کا صدمہ برداشت کیا بلکہ اپنے دن اور رات کا چین برباد کر کے اپنے بچوں کو بہتر مستقبل فراہم کرنے کی کوشش کی۔

شوہر کی وفات کے بعد پہلا مسئلہ تو گھر کے اخراجات چلانے کا تھا۔ کچھ اثاثہ وہ چھوڑ گئے تھے، تھوڑی بھاگ دوڑ کے بعد انہیں بھی ایک مقامی اسکول میں ملازمت مل گئی اور یوں زندگی کی گاڑی آہستہ روی سے چلتی رہی۔

"امی، امی! میں نے بھیا کا بستر بچھا دیا ہے۔" گڈو کی تیز آواز نے انہیں سوچوں کی دنیا سے واپس کھینچ لیا۔ وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ پھر وہ آکر ان کے پاس کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"شاباش بیٹے، اچھے بچے یونہی کام کرتے ہیں۔"

"امّی امّی وہ بلّی والا کھلونا ہے ناں... جو بھائی جان لائے تھے۔" اس نے ماں کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں، ہوں، کیا ہوا اُسے؟"

"وہ میں نے بستر کے نیچے رکھ دیا ہے۔"

"کیوں؟" انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"پتہ ہے امی جب بھائی جان تھکے ہوئے آئیں گے ناں تو سیدھے بستر پر جائیں گے لیٹنے کے لئے..... پھر جیسے ہی وہ بستر پر بیٹھیں گے..... میاؤں..... ہاہاہاہا....." اس نے آنے والے خوشگوار لمحات کے تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

"اللہ کتنا مزا آئے گا جب بھائی جان ڈر کے مارے اچھل پڑیں گے۔" اس نے خوشی سے ہاتھ ملتے اور گردن ہلاتے ہوئے اچھل اچھل کر کہا۔ امی نے ایک ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگائی۔

"بہت شریر ہو تم۔" انہوں نے کہا اور گڈو دوبارہ کمرے کی طرف بھاگ گئی، کسی نئی شرارت کے لئے۔

کشمش صاف ہو چکی تھی اور اب کھوپرے کو کاٹنا تھا۔ انہوں نے ریحانہ کو آواز دی کہ چھری لیتی آئے۔ ریحانہ آئی اور چھری ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہنے لگی۔

"آپ نے بھائی جان کو میری فرمائش تو لکھ دی تھی ناں؟"

"ہاں بھئی! وہ تمہارے لئے ڈھیر ساری کتابیں لا رہا ہے۔" امی جان نے چھری سے کھوپرے کو باریک کاٹتے ہوئے کہا۔ ایک دلکش سی مسکراہٹ ریحانہ کے چہرے پر دوڑ گئی اچھی کتاب ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہی تھی مطالعہ کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی سہیلیوں میں "فلاسفر" کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ بہت ساری کتابوں کے تصور ہی سے ایک انجانی مسرت اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگی تھی۔ اس نے بھائی سے بس کتابوں ہی کی فرمائش کی تھی اور وہ کتابیں لا رہا تھا۔ اس نے سوچا "اب تو بھائی ڈاکٹر بن چکا ہے یقیناً ان کے مالی مسائل ختم ہو جائیں گے اور وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے گی اب اسے فیس کے لئے کئی کئی روز انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ امی جان کو بھی نوکری چھوڑ دینی چاہئے۔" اس نے دور بیٹھی ہوئی ماں کی طرف دیکھا جو بظاہر تو کھوپرا کاٹ رہی تھیں مگر دھیان کہیں اور تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ آج اگر سلطان صاحب زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے۔ وہ شہاب کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اور ان کی خواہش آج پوری ہو گئی تھی۔ خیالات کا پنچھی ماضی کی سمت محوِ پرواز تھا۔ بیتے ہوئے دنوں کی حسین اور تلخ یادیں ایک فلم کی مانند ذہن کے پردے پر ابھر رہی تھیں۔ انہیں ننھا شہاب کبھی باپ کی انگلی تھامے اسکول جاتا ہوا نظر آتا کبھی ان سے اوٹ پٹانگ سوالات پوچھتا ہوا کبھی باغ میں کھیلتا ہوا۔

جب وہ دونوں باغ میں کھیل رہے ہوتے تھے تو اُن کے پسِ منظر میں سرینگر کے حسین پہاڑوں کا منظر بہت بھلا لگتا تھا۔ کبھی کبھی تو انہیں یوں محسوس ہوتا کہ پوری وادی کی رونق ہی اِن باپ بیٹوں کے دم سے ہے۔

کتنا پیار تھا دونوں میں بالکل دوستوں کی طرح لگتے تھے۔ پھر زندگی نے کروٹ بدلی اور سلطان صاحب نے آنکھیں موند لیں خوشیاں اس گھر سے روٹھ گئیں اور دکھ ان کی دہلیز پر آن بیٹھے لیکن وقت کا پہیہ چلتا رہا اور آج پھر اچھے دن اپنے جلو میں مسرتوں کی بارات لئے شباب کی صورت میں ان کے گھر آرہے تھے۔ بے اختیار اُن کا دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ..... انہوں نے گھبرا کر جلدی سے انہیں صاف کیا اور باورچی خانے کی طرف دیکھا کہ کہیں ریحانہ تو انہیں نہیں دیکھ رہی۔ مگر وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی یکدم ریحانہ بیل بٹہ چھوڑ کر اور گڈو اپنا کھیل ختم کر کے چیختی ہوئی دروازے کی طرف بھاگیں۔

"بھائی جان آگئے بھائی جان آگئے!!" گڈو نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ دروازہ ریحانہ نے کھولا تھا مگر دستک دینے والا شباب نہیں کوئی اور اجنبی تھا۔ ریحانہ نے فوراً کواڑ بند کر دیئے اور آنے والے سے اس کی آمد کا سبب دریافت کیا۔

"مسز سلطان صاحبہ کا گھر یہی ہے؟" اجنبی نے پوچھا۔

"جی ہاں" ریحانہ نے جواب دیا۔

"انہیں ذرا بھیجیں" آنے والے نے کہا۔ مسز سلطان اتنی دیر میں خود ہی دروازے تک پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے ریحانہ کو ایک طرف ہٹا کر اجنبی سے پوچھا۔

"جی فرمائیے، میں ہی مسز سلطان ہوں۔"

"وہ جی دراصل یہ ....." اس نے ایک اسٹریچر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کون ہے یہ"؟ مسز سلطان نے حیرت سے سوال کیا۔

"یہ جی شہاب صاحب ہیں، بھارتی فوج کی اندھا دھند فائرنگ سے شہید ہوگئے ہیں۔"

"اور ہاں" اجنبی نے آہستگی سے کہا یہ کچھ چیزیں ان کی لاش کے نزدیک سے ملی تھیں"

اجنبی نے اپنے بیگ میں سے چند خون آلود کتابیں اور ٹوٹے ہوئے کھلونے نکالے۔ مسز سلطان نے زرد چہرے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان تحفوں کو دیکھا ..... ریحانہ اور گڈو کے تحفے تو پہنچ چکے تھے لیکن مسز سلطان کا تحفہ تو رستے ہی میں چھن گیا تھا۔

شان الحق حقی

تکلف اور بے تکلفی

ہمارے بچپن کا ذکر ہے کہ ہم ایک دوسرے شہر میں جا کر ایک گھر میں مہمان ٹھہرے۔ ان لوگوں نے ہماری بڑی خاطر تواضع کی۔ رات کو سونے سے پہلے پوچھا گیا آپ میں سے کوئی دودھ پینا چاہے تو حاضر ہے۔ ہم بول پڑے کہ ہم پئیں گے، ہم تو روز پیتے ہیں۔ بات کچھ غلط بھی نہ تھی۔ گھر میں اکثر گائے یا بھینس رہتی تھی اور ہم سونے سے پہلے دودھ پیتے تھے۔

مگر ہمارے گھر والوں نے اس بے تکلفی پر ہمیں بڑی ملامت کی۔ تم ایسے ندیدے ہو۔ تمہیں مانگ کر دودھ پیتے ہوئے شرم نہ آئی۔ حالانکہ ہم نے خود نہیں مانگا تھا۔ ندیدپن "نادیدہ پن" سے بنا ہے۔ نادیدہ کے معنی ان دیکھا۔ اگر کوئی لڈوؤں کو للچائی نظروں سے دیکھے یا اس طرح چٹخارے لے کر کھائے جیسے یہ اسے نصیب ہی نہیں ہوتے تو یہ ندیدپن کہلائے گا۔

اس کے بعد کوئی ہمیں کچھ کھانے کو دیتا تو ہم صاف انکار کر دیتے! جی اس وقت تو دل نہیں چاہ رہا، میں تو کھا کے آیا ہوں، میرا پیٹ ٹھیک نہیں ہے۔ بالکل بناوٹی باتیں۔

ایک دفعہ شملے کے پہاڑ پر ہم اپنے ایک چچا کے ہاں گئے۔ وہاں کیک پیسٹری والا آیا۔ یہ لوگ سر پر جست کا صندوق اٹھائے گھر گھر کیک پیسٹری بیچنے آتے تھے۔ چچا نے ایک پاتی اور ایک پیسٹری ہمیں کھانے کو دی۔ ہم نے وہی توتے کا سا سبق دہرایا، جی اس وقت تو جی نہیں چاہ رہا۔ اس پر ہماری بڑی ہنسی اڑی۔ چچا نے تو ڈانٹ بھی دیا کہ کیا فضول بات ہے کھاتے کیوں نہیں۔

تکلف کے مقابلے میں ایک چیز بے تکلفی بھی ہے۔ اس کی بھی بعض دلچسپ مثالیں دیکھنے میں آتی رہتی ہیں۔ ہمارے والد صاحب کے پاس بیدری کام کا ایک حقہ تھا جسے کلی کہتے ہیں۔ کالی زمین پر روپہلی پھول پتے۔ ان کے ایک بے تکلف دوست آئے۔ حقے کی بڑی تعریف کی اور کہا بھئی یہ تو میں لے جاؤں گا۔ اب

اگر نہ دیں تو تھُڑدِلے کہلائیں۔ مگر والد صاحب نے ذرا ہمت سے کام لیا بے تکلفی کے جواب میں بے تکلفی برتی۔ کہا کہ بھئی یہ تو اس وقت میرے استعمال میں ہے میں تمہیں ایسا ہی اور منگا دوں گا۔

کراچی میں ہمارے ایک دوست کے پاس ایک اور دوست آ کر ٹھہرے۔ چھوٹا سا دو کمروں کا گھر تھا۔ مہمان بولے یہاں جگہ تنگ ہے میں کہیں اور ٹھکانہ ڈھونڈتا ہوں۔ صاحب خانہ نے کہا "کیوں کیا تنگی میں ساتھ نہ دو گے؟" اس سے پہلے یہ ان کے بڑے کشادہ مکان میں بھی مہمان رہ چکے تھے۔ بس پھر کیا تھا مہمان وہیں ٹھہر گئے اور عرصے تک تنگی میں ساتھ دیتے رہے۔

ہمارے ایک دوست کو تصویریں جمع کرنے کا شوق ہے۔ ان سے بعض لوگ بے تکلفی میں اچھے اچھے شاہکار مانگ کر لے جاتے ہیں اور یہ شرما شرمی میں دے ڈالتے ہیں۔ اسے مروت کہتے ہیں۔

مروت پر ایک لطیفہ اور یاد آیا ایک آدمی بیٹھا بسور رہا تھا۔ کسی نے سبب پوچھا، بولا کل میں فلاں جگہ گیا تھا ان لوگوں نے ناحق میری پٹائی کر دی۔ پوچھنے والے نے ہمدردی کی، دلاسا دیا، اور کہا۔ خیر سمجھ لیں گے ان سے۔ اب صبر کرو بولا نہیں۔ انھوں نے آج پھر بلایا ہے اور مروّت میں جانا پڑتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ تکلف اچھی چیز ہے یا بُری اور مروّت کس حد تک برتنی چاہئے۔ مشہور شاعر ذوقؔ کہتے ہیں۔!

اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

اس کو کسی نے یوں پلٹا ہے!

اے ذوقؔ تکلف ہے شرافت کی نشانی
دہقان ہے وہ جو کہ تکلف نہیں کرتا

دہقان یعنی گنوار۔ تکلف میں بے شک تکلیف ہے اور بے تکلفی میں آرام شریف آدمی کو یہ ضرور دیکھنا چاہئے کہ اس کے آرام سے کسی کو بے آرامی یا نقصان تو نہیں ہو گا۔

اصل چیز نیت ہے۔ اگر بناوٹ کسی کو دھوکا دینے کے لئے برتی جائے تو بُری بات ہو گی لیکن سچی بات یہ ہے کہ تہذیب کے ساتھ بناوٹ لازم ہے اس بات کو یوں سمجھئے کہ ہر انسان کی کچھ ضرورتیں کچھ خواہشیں ہوتی ہیں اب اگر سب اپنی اپنی خواہشیں پوری کرنے میں لگ جائیں تو کسی کی خواہش بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے تبھی زندگی گزر سکتی ہے فطری خواہش تو یہ ہے کہ اپنا پیٹ بھرو۔ تہذیب کہتی ہے خود چاہے بھوکے رہو مہمان کو کھانا کھلاؤ۔ فطری خواہش یہ کہ اپنی جان بچاؤ، انسانیت کا تقاضہ ہے کہ ضرورت پڑے تو کسی اعلیٰ مقصد کے لئے جان پر کھیل جاؤ۔

اپنی دُنیا آپ پیدا کر

سیّد نظر زیدی

"بی بی جی اپنے بچے کو گاڑی میں بٹھالیں" یہ آواز سنی تو شاہینہ بیگم نے گھوم کر دیکھا بارہ تیرہ برس کا لڑکا بچہ گاڑی لئے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ انہوں نے بے پروائی سے کہا "نہیں بھئی، میں اپنے بچے کو گود میں لئے آسانی سے چل رہی ہوں۔"

"بی بی جی، اللہ آپ کا بھلا کرے۔ مہربانی کریں اور بچے کو گاڑی میں بٹھالیں۔ آپ کے ہوٹل تک پہنچادوں گا اور بس ایک روپیہ لوں گا"۔ لڑکے نے یوں کہا جیسے بھیک مانگ رہا ہو۔

"تم سے کہا نا ضرورت نہیں ہے" شاہد صاحب نے سختی سے کہا۔ انہیں اس بات پر غصہ آگیا تھا کہ منع کرنے کے باوجود لڑکا ضد کر رہا تھا۔ گاڑی والے بچے کی یہ ضد شاہینہ بیگم کو بھی بُری لگی تھی، لیکن ان کے شوہر نے غریب بچے کو ڈانٹا تو وہ رک گئیں اور شاہد صاحب کی طرف دیکھ کر بولیں۔ "میرا خیال ہے احمد بیٹے کو بٹھالیتے ہیں گاڑی میں، میں کچھ تکان بھی محسوس کر رہی ہوں۔"

"اور یہ تکان شاید اس لئے محسوس ہوئی ہے کہ میں نے جو منع کر دیا ہے؟" شاہد صاحب نے ناراض ہو کر کہا۔

"یہ بات نہیں۔ لگتا ہے اس غریب کو ابھی تک مزدوری نہیں ملی۔ چہرے سے بھوکا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ بات بھی غلط نہیں کہ میں تھک گئی ہوں۔" شاہینہ بیگم نے نرمی سے کہا اور اپنے بیٹے کو گود سے اتار کر بچہ گاڑی میں بٹھا دیا۔

ایسے موقعوں پر ان میاں بیوی میں عام طور پر چھوٹا موٹا جھگڑا ہو جایا کرتا تھا۔ شاہد صاحب اپنی بات منوانا چاہتے تھے اور شاہینہ بیگم اپنی لیکن اس وقت شاہد صاحب اپنی عادت کے خلاف خاموش ہو گئے اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

یہ واقعہ کوہ مری کے مال روڈ کا ہے۔ دونوں میاں بیوی ضرورت کی کچھ چیزیں خرید کر لوٹ رہے تھے کہ لڑکے نے ان سے درخواست کی اور شاہینہ بیگم کی نرم دلی کی وجہ سے مزدوری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

............☆............

ہوٹل پہنچ کر شاہینہ بیگم نے مزدور لڑکے کو ایک روپے کے بجائے دو روپے دیئے، لیکن اس نے ایک روپیہ واپس کر دیا اور بہت ادب سے کہا۔ "نہیں بیگم صاحب جی، میں ایک روپیہ ہی لوں گا۔ میں نے ایک روپیہ ہی مانگا تھا۔ یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے اپنے بچے کو میری گاڑی میں بٹھایا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ آج شاید خالی ہاتھ ہی گھر جانا پڑے گا۔ ابھی امیر لوگ آئے نہیں نا، اس لئے کم ہی کام ملتا ہے۔"

شاہد صاحب مزدور لڑکے سے ناراض تھے اگرچہ وہ خاموش ہو گئے تھے، لیکن ان کا فیصلہ یہی تھا کہ اس چالاک لڑکے نے ان کی بیوی سے زبردستی روپیہ وصول کیا ہے، لیکن جب اس نے دوسرا روپیہ واپس کیا اور صاف لفظوں میں کہا کہ وہ اپنے حق سے زیادہ نہیں لے گا تو وہ انہیں بہت اچھا لگا۔ ان کی یہ رائے بدل گئی کہ وہ ایک چالاک لڑکا ہے۔ انہوں نے نرمی سے کہا۔ "کوئی حرج نہیں بیٹے، جب بیگم صاحبہ اپنی خوشی سے روپیہ دے رہی ہیں تو لے لو!"

"نہیں جناب، میں اپنے حق سے زیادہ نہیں لوں گا۔" لڑکے نے بہت ادب سے کہا اور اپنی گاڑی کا رخ موڑ کر وہاں سے جانے لگا۔

شاہد صاحب نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "اچھا اپنے حق سے زیادہ نہ لو، لیکن ہماری دعوت تو قبول کر لو، دعوت قبول کرنا تو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنّت ہے۔ ہم چاہتے ہیں تم ہمارے ساتھ چائے پیو۔ ہم تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ تم تو ماشاء اللہ بہت اچھے بچے معلوم ہوتے ہو۔"

"ہاں بیٹے، کچھ دیر رک جاؤ۔ چائے تیار ہے پیتے ہی چلے جانا۔" شاہینہ بیگم نے بھی محبت بھری آواز میں کہا لڑکا کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر چائے پینے پر رضامند ہو گیا۔

☆

لڑکا بالکل معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ کرتے اور شلوار پر دو تین پیوند بھی لگے ہوئے تھے، لیکن اس کا یہ معمولی لباس بہت صاف ستھرا تھا۔ اسی طرح اگرچہ وہ پتلا دبلا اور کمزور سا تھا، لیکن اس کے چہرے سے شرافت ظاہر ہوتی تھی۔ چائے بھی اس نے بہت سلیقے اور تمیز سے پی نہ چائے کی پیالی میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھائے اور نہ پیٹو بچوں کی طرح زیادہ چیزیں کھائیں۔

شاہد صاحب لاہور کے ایک بڑے کالج میں نفسیات پڑھاتے تھے۔ اس علم سے انسانوں کی عادتوں، بلکہ دلوں میں چھپے خیالات تک کا حال معلوم کیا جاتا ہے، وہ چھپی نظروں سے لڑکے کی طرف دیکھتے رہے اور اس کی تمیز داری سے انہیں یہ یقین ہو گیا کہ وہ کسی شریف خاندان کا بیٹا ہے۔

چائے پینے کے بعد لڑکے نے جانے کی اجازت مانگی تو شاہد صاحب نے کہا۔ "بیٹے، ہمارا دل تو چاہتا ہے تم کچھ دیر اور ہمارے پاس بیٹھو، لیکن تمہیں مجبور نہیں کرتے، ہو سکتا ہے کوئی ضروری کام ہو۔"

"جی اب کوئی کام تو نہیں، لیکن میں گھر جلدی سے جلدی پہنچنا چاہتا ہوں، میں جاؤں گا تو امی جان کھانے کا انتظام کریں گی۔" لڑکے نے کہا،

"کیا تمہارے گھر میں کوئی اور کمانے والا نہیں ہے؟" شاہینہ بیگم نے پوچھا۔

لڑکا دکھ بھری آواز میں بولا۔ "جی ابو کا ایک برس پہلے انتقال ہو گیا، امی جان بیمار ہیں، کھانے پینے کا انتظام انہیں پیسوں سے ہوتا ہے جو میں کما کر لے جاتا ہوں۔"

"اوہ!" شاہد صاحب نے رحم بھری نظروں سے لڑکے کو دیکھا۔ "پھر تو بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہو گی تم لوگوں کو؟"

"جی بس ایسا ہی ہے، لیکن اللہ کا شکر ہے۔ اچھے بُرے دن گزر رہے ہیں۔ امی جان کہا کرتی ہیں جب میں کچھ اور بڑا ہو جاؤں گا تو زیادہ پیسے کمایا کروں گا اور ہماری ساری تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔" لڑکے کی آواز میں بہت اداسی تھی۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو، لیکن بیٹے زیادہ پیسے کمانے کی بات تو اس وقت پوری ہو سکتی ہے جب تم تعلیم حاصل کرو۔" شاہد صاحب نے کہا۔ لڑکا بولا "جی مجھے پڑھنے کا شوق تو بہت ہے، لیکن اسکول میں داخل نہیں ہو سکتا، سارا دن تو مال روڈ کے چکر کاٹتا رہتا ہوں۔"

"تمہارے ابو کیا کام کرتے تھے؟" شاہینہ بیگم نے سوال کیا۔

"جی وہ کراچی میں کام کرتے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ وہیں رہتے تھے، پھر ایسا ہوا کہ کسی ظالم نے گولی مار کر انہیں شہید کر دیا اور امی ہمیں ساتھ لے کر یہاں اپنے وطن کوہ مری آ گئیں۔" لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، شاید اسے اپنے ابو یاد آ گئے تھے۔

شاہینہ بیگم اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے چین ہو گئیں۔ تسلی دیتے ہوئے بولیں، "رنج نہ کرو بیٹے انشاء اللہ تمہاری امی کی بات سچ ثابت ہو گی اور تم بڑے ہو کر بہت سارے روپے کمایا کرو گے۔"

"لیکن کس طرح؟ جب میں تعلیم ہی حاصل نہ کر سکوں گا تو زیادہ روپے کس طرح کماؤں گا!" لڑکے کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

اس کی حالت دیکھ کر شاہد صاحب اس کے پاس آ بیٹھے اور بہت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "بیٹے، اللہ کی شان بڑی ہے، وہ چاہے گا تو تمہارے لئے بہت آسانیاں پیدا کر دے گا، شرط بس یہ ہے کہ محنت سے کام لو اور اپنی حالت سدھارنے کے لئے برابر کوشش کرتے رہو۔"

"جی غریبوں کی کوشش سے بھی کیا ہوتا ہے۔ یقین کیجئے کوئی کوئی دن تو ایسا آتا ہے کہ صبح سے شام تک مال روڈ کے چکر لگاتا رہتا ہوں ایک ایک بیگم کی خوشامد کرتا ہوں، لیکن میری گاڑی خالی ہی رہتی ہے اور میں خالی ہاتھ گھر جاتا ہوں۔"

"یہ صرف آزمائش کی بات ہے بیٹے، اللہ پاک یہ دیکھتے ہیں کہ میرا بندہ تکلیف کے وقت بھی نیک رہتا ہے یا نہیں، اور جو لوگ غریبی میں بھلائی کو نہیں چھوڑتے ان کی اس طرح مدد فرماتا ہے کہ وہ خود حیران رہ جاتے ہیں۔" شاہد صاحب نے لڑکے کو تسلی دی۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔" لڑکے نے بے دلی سے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے ہم تمہیں بہکا رہے ہیں؟ نہیں بیٹے، یہ بات نہیں۔ ہم تو وہ بات کہہ رہے ہیں جو ہم نے پوری طرح آزمائی ہے، یہ سن کر شاید تم حیران ہو گے کہ اپنے بچپن میں ہم تم سے بھی زیادہ غریب اور بے سہارا تھے۔ تمہارے پاس تو یہ بچہ گاڑی ہے، ہمارے پاس تو ایسی بھی کوئی چیز نہ تھی کہ محنت مزدوری کر کے چند روپے کما سکتے۔" شاہد صاحب نے کہا، ان کے چہرے سے لگتا تھا انہیں اپنی پہلی زندگی کی کچھ باتیں یاد آ گئی ہیں۔

مزدور لڑکا یہ بات سن کر حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ شاہد صاحب ذرا دیر رک کر بولے۔ "جس طرح تمہارے ابا جان کا اچانک انتقال ہو گیا، اسی طرح ہمارے پیارے ابو ہم سے ایکا ایکی بچھڑ گئے

تھے۔ انہیں دلی کے ظالم ہندوؤں نے اس وجہ سے شہید کر دیا تھا کہ وہ پاکستان حاصل کرنے کی کوششوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اس کے چند دن بعد انہوں نے ہمارے گھر پر حملہ کر دیا۔ سارا سامان لوٹ کر لے گئے میری اور میری امی جان کی جان مشکل سے بچی اور ہم ریل گاڑی میں سوار ہو کر لاہور آ گئے۔"

"یہ تو آپ اس زمانے کی بات کر رہے ہیں شاید جب پاکستان بنا تھا؟ میری امی جان سنایا کرتی ہیں اس زمانے کی باتیں۔ بہت ظلم ہوا تھا مسلمانوں پر!" لڑکے نے کہا۔ وہ شاہد صاحب کی یہ باتیں بہت حیران ہو کر سن رہا تھا۔ "کیا آپ اس سے آگے کی بات بھی سنائیں گے؟" "ہاں بیٹے، اس زمانے کی تو اس سے آگے کی کہانی سنو، جیسا کہ بتا چکا ہوں میں چھٹی جماعت میں پڑھ رہا تھا اور اپنی جماعت کا مانیٹر تھا، لیکن لاہور میں تعلیم جاری نہ رکھ سکا، ہم ایسے غریب ہو گئے تھے کہ مجھے ایک امیر آدمی کے گھر نوکری کرنی پڑی۔ اس طرح میری امی جان پاس پڑوس کے گھروں میں جا کر ان کے برتن اور کپڑے دھوتی تھیں، تب دو وقت کی روٹی ملتی تھی اور دوسری ضرورتیں پوری ہوتی تھیں، لیکن اس مصیبت کے زمانے میں بھی ایک بات ایسی تھی کہ اب بھی یاد آتی ہے تو دل خوشی سے بھر جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی اچھی عادتیں نہ چھوڑی تھیں۔ میری امی جان پانچوں وقت پابندی سے نماز پڑھتی تھیں، اللہ سے دعا مانگتی تھیں اور اپنے چھوٹے سے گھر اور اپنے کپڑوں کو خوب صاف ستھرا اور پاک رکھتی تھیں۔ اسی طرح میں تعلیم حاصل کرنے کی دھن میں لگا رہتا تھا۔"

"لیکن جب اسکول ہی نہ جاتے تھے تو تعلیم کس طرح حاصل کرتے تھے؟" لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہم یہ کرتے تھے بیٹے کہ جب ماسٹر صاحب امیر آدمی کے بچوں کو پڑھانے آتے تھے تو ذرا دور بیٹھ جاتے تھے اور بہت غور سے ان کی باتیں سنتے اور یاد کرتے رہتے تھے۔ ہمارے پاس کتابیں نہ تھیں۔ کاپیاں نہ تھیں، لیکن اللہ پاک نے اپنی خاص مہربانی سے دماغ میں ایسی طاقت پیدا کر دی تھی کہ جو سنتے تھے یاد ہو جاتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ علم حاصل کرنے کا شوق تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا، چنانچہ انہی دو باتوں کے سہارے ہم نے پہلے آٹھویں جماعت پاس کی۔ پھر میٹرک کا امتحان دیا اور یونہی ایک ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بہت عزت کے ساتھ ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی اور گورنمنٹ کالج میں استاد بن گئے اور ہماری ساری مصیبتیں ختم ہو گئیں۔"

"واہ جی، آپ کی کہانی تو بہت شاندار ہے۔" لڑکے کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

شاہد صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "صرف ہماری کہانی ہی نہیں، بلکہ اس دنیا میں ایسی شاندار

کہانیاں بہت سی ہیں، بلکہ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر آدمی کی ایک کہانی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں کچھ کہانیاں بہت اچھی اور کچھ خراب ہیں۔ اچھی کہانیاں ان لوگوں کی ہیں جنہوں نے نیکی کے راستے کو پسند کیا محنت کی عادت اپنائی، علم حاصل کیا اور سینہ تان کر آگے بڑھتے چلے گئے۔ بُری کہانیاں ان کی ہیں جنہوں نے اللہ پاک کی دی ہوئی طاقتوں سے غلط کام لیا اور برائیوں میں پھنس گئے ہماری اس دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ملیں گے جو اچھے خاندانوں میں پیدا ہوئے تھے اللہ پاک نے اپنی خاص مہربانی سے اچھا ذہن بھی دیا تھا، لیکن انہوں نے ان نعمتوں کی قدر نہ کی برائی کے راستے پر چل نکلے اور اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ اسی طرح ایسے لوگ بھی بہت ہیں جنہیں بالکل چھوٹی عمر میں بہت مصیبتیں اٹھانی پڑیں، لیکن انہوں نے اچھی عادتیں اپنا کر ان مصیبتوں اور پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہ کہانیاں چاروں طرف بکھری پڑی ہیں اور اسی میں ایک کہانی تمہاری بھی۔ ہے جو تم شروع کر رہے ہو، اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اسے ایک بہادر آدمی کی شاندار کہانی بناتے ہو یا ایک نالائق اور بزدل آدمی کی بُری کہانی!"

جناب، میں اپنی کہانی کو ایسا شاندار بناؤں گا کہ سب حیران رہ جائیں گے۔ آج مجھے یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ اللہ پاک نے ہر انسان کو، چاہے وہ غریب ہو یا امیر اپنی زندگی کو شاندار بنانے کا اختیار اور طاقت دی ہے، ساری بات تو نیکی کے راستے پر چلنے اور محنت کرنے کی ہے۔"

بات ختم کر کے لڑکا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بچہ گاڑی لے کر وہاں سے چلا گیا۔

شاہینہ بیگم اور شاہد صاحب تعریف بھری نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ لگتا تھا انہوں نے اسکی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے!

چیونٹیاں

ترجمہ: اُنعم گل انوار

آپ نے کبھی غور کیا کہ اس وسیع کرۂ ارض پر چیونٹی جیسی حقیر مخلوق کی کیا حیثیت ہے؟ چیونٹی کا قد بہ مشکل ایک انچ کے ۲۵ ویں حصے کے برابر اور وزن عام آدمی کے وزن کے دس لاکھویں حصے سے بھی کم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب یہ بے حیثیت مخلوق مل جل کر کام سرانجام دیتی ہے تو اس کا شمار کرۂ ارض کی غالب قوتوں میں ہوتا ہے۔ ایسا کیسے ممکن ہوتا ہے؟ آیئے دیکھتے ہیں۔

ماسوائے دنیا کے قطبی علاقوں کے (کہ وہاں سردی کی شدت کے باعث زندگی تقریباً ناممکن ہے) دنیا کے ہر خطے میں پائی جانے والی اس مخلوق کی اب تک لگ بھگ پونے نو ہزار اقسام دریافت ہو چکی ہیں گرم علاقوں میں ایک مربع ایکڑ پر کروڑوں کی تعداد میں چیونٹیاں پائی جاتی

باف چیونٹیاں کوئی بھاری کام کرنے کے لئے ایک دوسری کے ساتھ زنجیر بنا کر اپنی قوت ایک جگہ مجتمع کر سکتی ہیں۔

ہیں۔ دنیا میں خشکی پر جتنے بھی فقاری جانور (وہ جانور جن میں ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے) پائے جاتے ہیں ان سب کی مجموعی تعداد سے کہیں زیادہ تعداد چیونٹیوں کی ہے۔ چیونٹیوں کی اندازاً تعداد دس ملین بلین (ایک سینکھ) کے قریب اور مجموعی وزن ۱۰ ارب کلو گرام ہے۔ خشکی بھر کی کل جاندار مخلوق کا دس فی صد صرف چیونٹیاں ہیں۔

انسان اپنی بقا کے لئے بڑی حد تک اسی معمولی

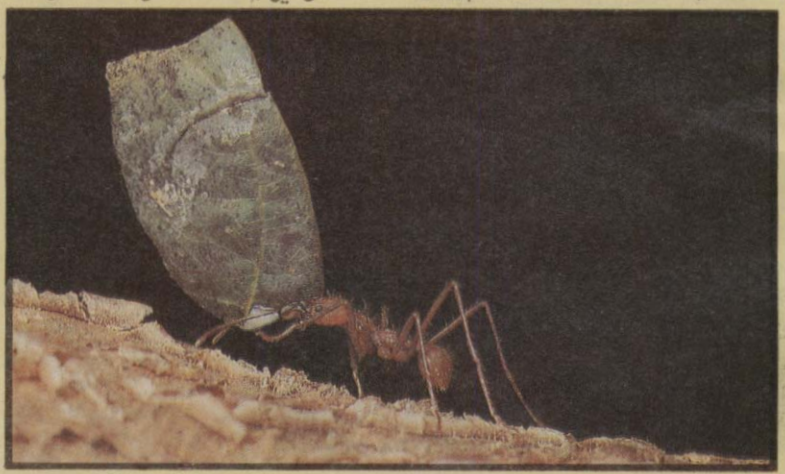

کارکن پتا کتر چیونٹی "کاشتکاری" کی غرض سے ایک بڑا پتا اپنے طاقتور جبڑوں میں اٹھائے لئے جا رہی ہے۔

کیڑے کا مرہون منت ہے کیوں کہ زمین کے بیشتر حصے کو چیونٹیاں اور دیمک ہی زرخیز بناتے ہیں نیوانگلینڈ جیسے علاقوں، جہاں ان کی تعداد کم ہوتی ہے، چیونٹیاں کینچوؤں کی نسبت زیادہ رقبے کو نرم اور زرخیز بناتی ہیں۔ گرم علاقوں کی بات ہی کیا۔ پھر ان کا ایک کردار پودوں کے بیج ایک جگہ سے دوسری جگہوں تک پھیلانے اور مردہ جانوروں کو ٹھکانے لگانے کا بھی ہے۔ مرنے والے ۹۰ فیصد چھوٹے جانوروں کو چیونٹیاں چٹ کر جاتی ہیں اس طرح ہماری کاشت کاری اور شجر کاری میں ہماری مدد کر کے نیز ماحول کو خوشگوار رکھنے کے لئے حشرات اور چھوٹے جانوروں کو چٹ کر کے یہ مخلوق انسان کی زندگی آسان بناتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چیونٹیاں یہ ذمہ داریاں کیسے ادا کرتی ہیں اور کیوں کر کرۂ ارض کے ماحولیاتی نظام پر اپنی "گرفت" مضبوط کرتی ہیں؟

اس سلسلے میں سب سے اہم چیز چیونٹیوں کا معاشرتی نظم و ضبط (یعنی مل جل کر رہنے کا نظام) ہے۔ اس لحاظ سے یہ حقیر مخلوق نہیں ہیں۔ تلاش خوراک کی مہم میں چیونٹیاں انفرادی نہیں اجتماعی طور پر حصہ لیتی ہیں۔ مزدور کارکن چیونٹیاں لاکھوں کی تعداد میں نکلتی ہیں اور ایک عظیم الجثہ امیبا کی طرح زمین پر پھیلتی اور دوبارہ اکٹھی ہوتی ہیں چنانچہ یہ ایک ہی وقت میں ایک وسیع خطہ پر اپنا "گشت" مکمل کر لیتی ہیں۔ مزدور چیونٹیاں نسل بڑھانے میں کوئی حصہ نہیں لیتیں بلکہ ان کا کام آزادانہ طور پر ملکہ اور بستی کی دیگر چیونٹیوں کے لئے خوراک جمع کرنا ہوتا ہے۔ نتیجتاً انہیں عام منفرد حشرات کی نسبت اپنے ذخائر خوارک کی حفاظت میں بڑا خطرہ مول لینا پڑتا ہے مثال کے طور پر شمالی افریقہ کی گلائی فس بائی کلر (GLYPHIISBI-COLOR) یا "صحرائی چیونٹیاں" بڑی مکڑیوں یا "ڈاکو مکھیوں" کا نوالہ بننے سے قبل اوسطاً چھ روز تک خوراک جمع کرتی ہیں اور ہر کارکن چیونٹی مرنے سے قبل باقی اہل بستی کے لئے اپنے وزن سے بیس گنا زیادہ خوراک زیر زمین گھروندوں تک پہنچا چکی ہوتی ہے۔

باف چیونٹیوں کے فضائی مستقر۔ (AERIALPA VILLION) کا ایک حصہ

مزدوروں یا کارکنوں کی زندگی معمولی ہوتی ہے۔
مزدوروں یا کارکنوں کی زندگی معمولی ہوتی ہے لیکن ان کی کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں ملکہ چیونٹی کی سب سے "کماؤ" اولاد کہا جاتا ہے۔

کارکنوں کی جسمانی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے جو خطرناک یا مہلک ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ ان کے جسم میں نسل خیزی کی کوئی خصوصیت نہیں ہوتی۔ اس کے بجائے انہیں بعض ایسے "ہتھیاروں" سے نوازا گیا ہوتا ہے جنہیں وہ کسی بھی وقت مقابلے میں استعمال کر سکتی ہیں مثال کے طور پر ملائشیا کی کیمپونوٹس (CAMPONOTUS) یا بڑھئی چیونٹیاں خطرے کے وقت بم کی طرح کام کرتی ہیں۔ ان کے پورے جسم میں ایسے غدودوں کی بھر مار ہوتی ہے جن میں زہر بھرا ہوتا ہے۔ لڑائی کی صورت میں وہ جلد کے شگاف کھول دیتی ہیں جن سے زہریلے مواد کی پھوار نکل کر دشمن پر جا پڑتی ہے۔ عین اسی وقت وہ ساتھی کارکنوں کی مدد طلب کرنے کے لئے ان غدودوں سے ایک اور قسم کا مادہ خارج کرتی ہیں۔ جس کی خوشبو دیگر چیونٹیوں کو اسے واقع سے آگاہ کرتی ہے اور وہ دوڑی چلی آتی ہیں۔

دفاعی ہتھیاروں اور پیغام رسانی کے اشاروں کا نظام مختلف اقسام کی چیونٹیوں میں مختلف ہوتا ہے۔ تاہم سب سے زیادہ ترقی یافتہ نظامِ دفاع سولنوپسس اِن وِکٹا (SOLENOPSIS INUICTA) یا آتشی چیونٹیوں کا ہوتا ہے جن کا اصل وطن اگرچہ جنوبی برازیل ہے لیکن حالیہ چند برسوں میں ان کی نسل ریاستہائے متحدہ اور امریکہ کے جنوبی حصوں تک بڑی سرعت سے پھیل چکی ہے۔ ان کو آتشی چیونٹیاں کہنے کی وجہ ان کے زہر میں شامل وہ کیمیائی مواد ہے جو جلد کے جس حصے پر پڑے وہاں دھکتی ہوئی سوئی کی نوک لگنے کی سی جلن پیدا ہوتی ہے۔ اگر کبھی آتش چیونٹیوں کی بستی پر دشمن حملہ آور ہو جائے تو وہاں موجود تقریباً ایک لاکھ کارکن حملہ آور پر اتنا زہر اسپرے کر دیتی ہیں کہ وہ حملہ بھول کر اپنی جان بچانے کی کوشش کرنے لگتا ہے اور اس کوشش میں وہ شاذ و نادر ہی کامیاب ہوتا ہے۔ جب یہ چیونٹیاں بستی سے باہر خوراک کی تلاش میں مصروف ہوتی ہیں اگر اس وقت دشمن کیڑے یا جانور ایک یا چند چیونٹیوں پر حملہ کر دیں تو حملہ زدہ چیونٹیاں ایک خاص قسم کا مواد خارج کرتی ہیں جس کی مدد سے پوری فوج پل بھر میں وہاں اکٹھی ہو جاتی ہے۔ تلاش خوراک کے دوران میں کسی کارکن کو کوئی بڑا کیڑا یا خوراک کا ٹکڑا نظر آ جائے جسے وہ اکیلی نہ لے جا سکتی ہو تو وہ فوراً وہاں سے واپس اپنی بستی کی طرف بھاگتی ہے اور اس دوران میں عقبی ڈنگ کی نوک سے کیمیائی مواد کی ایک باریک سی لکیر چھوڑ جاتی ہے۔ فار نے سینز (FARNESENES) نامی اس مواد میں ہم نسل چیونٹیوں کو اپنی طرف کھینچنے اور مذکورہ خوراک کی طرف ان کی رہنمائی کرنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ زمین پر پڑتے ہی یہ مواد ایک بادل کی شکل اختیار کر کے اس راستے پر مرغولے کی ایک لکیر کی سی بنا دیتا ہے جو دراصل چیونٹیوں کا راستہ ہوتا ہے۔ ساتھی کارکن بخارات کی اس لکیر کے اندر اندر چلتی ہیں۔ اس دوران میں وہ اپنی مونچھوں (ANTENNAE) کو آگے پیچھے حرکت دے کر اس چیز کا اندازہ کرتی رہتی ہیں کہ بخارات کے مالیکیولی اجزاء میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی یعنی وہ اس بادل سے باہر تو نہیں نکل رہیں اس طرح وہ بادل کے گھنے حصے میں چلتی ہوئی خوراک تک پہنچ جاتی ہیں اور راستے میں کتنے ہی موڑ اور اونچ نیچ کیوں نہ آئیں

وہ گمراہ نہیں ہوتیں۔ جائے مطلوبہ پر پہنچ کر کچھ چیونٹیاں خوراک کو ٹھکانے لگانا شروع کر دیتی ہیں جب کہ باقی کارکن ان کے گرد دائرہ بنا کر دفاعی ذمہ داری سرانجام دیتی ہیں۔

آج تک کی معلومات کے مطابق نہ صرف چیونٹیوں بلکہ دنیا بھر کے جانوروں میں سب سے زیادہ پیچیدہ اور حیرت انگیز کیمیائی ذخیرہ ایکو فلاّ (OCOPHYLLA) یا "باف چیونٹیوں" کے جسم میں ہوتا ہے (باف سے مراد بُننے والی)۔ باف چیونٹیاں جنوب مشرقی ایشیاء اور شمالی آسٹریلیا کے جنگلات میں درختوں پر بہ افراط مجتمع رہتی ہیں۔ یہ اپنے لاروے سے نکلنے والی ایک مہین تار کی مدد سے درخت کے پتوں اور ٹہنیوں کو آپس میں باندھ کر ایک بہت بڑا فضائی خیمہ (AERIAL PAVILION) تیار کر لیتی ہیں (تصویر ملاحظہ کیجئے۔) اپنے آپ کو اس طرح محفوظ کر لینے کے بعد ان کی ایک آبادی بیک وقت کئی درختوں پر "حکمرانی" کرتی ہے اور اس "اقتدار" کے بل بوتے پر یہ دشمن حشرات اور چھوٹے جانوروں کی بستیوں پر حملے کرتیں اور شکست خوردہ جانوروں کو اپنی خوراک بناتی ہیں۔

چیونٹیاں نہ صرف یہ کہ انسان کی طرح منظم معاشرتی زندگی بسر کرتی ہیں بلکہ چیونٹیوں کی بعض اقسام انسانی معاشرے کی بعض خصوصیات بھی اپنے اندر رکھتی ہیں۔ ان میں سے پہلے قسم ملائشیا کے مرطوب جنگلات میں پائی جانے والی ہائپو کلینا (HYPOCLINEA) نامی چیونٹی ہے۔ یہ ہماری طرح "پالتو جانور" رکھتی ہے اور اپنا مسکن مسلسل زیادہ بہتر چراگاہوں کی طرف بدلتی رہتی ہے۔ ان کے پالتو جانور کھٹمل کی قسم کے کیڑے ہوتے ہیں۔ میلی بگ (MEALY BUG) نامی یہ کھٹمل پودوں اور پتوں کا وہ رس چوستے ہیں جس میں امائنو ایسڈ کی بہتات ہوتی ہے۔ میلی بگ اس کا حصہ قطروں کی صورت میں اپنی میزبان چیونٹیوں کے لئے خارج کرتا رہتا ہے۔ جس سے ہائپو کلینا چیونٹیاں اپنا پیٹ بھرتی ہیں۔ اُن کی اس "خدمت" کے عوض چیونٹیاں ان کی حفاظت کرتی ہیں اور جب ایک درخت کے پتوں میں سے رس ختم ہو جاتا ہے تو ان کھٹملوں کو نہایت نرمی سے جبڑوں میں اٹھا کر دوسرے درخت تک لے جاتی ہیں۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ کیوں کہ ان کی خوراک گھر کے اندر ہی ملتی رہتی ہے اس لئے انہیں دور دراز جانے کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ یہ اپنی بستی سے اسی وقت باہر نکلتی ہیں جب پوری کی پوری بستی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے۔ یہ باقاعدہ گھونسلے بھی نہیں بناتیں بلکہ کارکن چیونٹیاں ملکہ اور ان کھٹملوں کی حفاظت کے لئے ان کے ارد گرد حصار سا بنائے رکھتی ہیں اور یہی ان کی آبادی ہوتی ہے ...... اس نوعیت کی ایک اور نسل ایسیٹن بکیلی (ECTION BURCHELLI) یا "فوجی" چیونٹیاں ہیں جو وسطی اور جنوبی امریکہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان کو "فوجی" چیونٹیوں کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ فوج کی طرح بغیر کسی سائبان یا خیمے کی پڑاؤ ڈالتی ہیں اور اجتماعی طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے۔ ہر کارکن چیونٹی چوتھائی انچ طویل ہوتی ہے اور ان کی ایک بستی پونے دو لاکھ سے لے کر سات لاکھ کارکنوں تک پر مشتمل ہوتی ہے تلاش خوراک کا انداز بھی فوج کی ایکسائیز (کسرت) سے مشابہ ہوتا ہے صبح سویرے ہزاروں چیونٹیاں پڑاؤ چھوڑ کر ایک قطار کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جو کچھ دیر بعد ایک فٹ فی منٹ کے حساب سے اطراف میں پھیلنا شروع ہو جاتی ہیں۔

اور آگے بھی بڑھتی رہتی ہیں۔
بلاشبہ فوجی چیونٹیوں کی نقل حرکت انسان کی نقالی کی ایک مناسب مثال ہے لیکن اس سلسلے میں سر فہرست نام لیف کٹنگ (LEAF CUTTING) یا پتا کتر چیونٹیوں کا ہے۔ غالبًا انسان کے علاوہ واحد مخلوق ہے جو "کاشتکاری" بھی کرتی ہے۔ جانوروں کی دنیا کی یہ سب سے زیادہ باکمال کسان یا باغبان بڑے حیران کن طریقے سے سبزے پر فنجائی (FUNG-US) یا مار روغ (ایک قسم کی خودرو نبات جسے سانپ کی چھتری بھی کہا جاتا ہے) کی کاشت کرتی ہے۔ ارجنٹائنا سے لاؤزیانا تک کے علاقوں میں اس کی اب تک چالیس سے زیادہ قسمیں دریافت ہو چکی ہیں۔ بعض درختوں کے پتے زہریلے ہوتے ہیں اور ان کو براہ راست کھانا نقصان دہ ہوتا ہے۔ لیکن پتّا کتر چیونٹیاں ہر قسم کے پتوں کو استعمال میں لا سکتی ہیں ان معلومات کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ جسامت میں سب سے چھوٹی نظر آنے والی مخلوق اپنی عقل میں بڑے بڑے حیوانوں سے بڑی ہے۔

ایک بہت اچھی خبر

خلیج سے آنے والے طلبہ کا مسئلہ حل ہو گیا

اسلام آباد ۱۲ اکتوبر (پی پی آئی) وزارت تعلیم نے خلیج کے بحران کے باعث کویت اور عراق سے وطن واپس آنے والے طلبہ و طالبات کے داخلے کا مسئلہ حل کر دیا گیا ہے اس سلسلے میں پہلی سے دسویں جماعت تک کے طلبہ و طالبات کو تمام وفاقی اسکولوں میں داخلے کی سہولت فراہم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ جب کہ کالج کی سطح پر تمام طلبہ و طالبات کو شام کی کلاسوں والے مخصوص وفاقی کالجوں میں داخلہ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔

پچھلے مہینے ہم نے اپنے اداریئے میں کویت سے آنے والے بچوں کا یہ مسئلہ اٹھایا تھا کہ چونکہ وہ کویت سے لٹے پٹے آرہے ہیں اس لئے انہیں فوراً تعلیمی اداروں میں داخلے دیئے جائیں۔ اور اس سلسلے میں ان سے تعلیمی اسناد اور دیگر سرٹیفکیٹس نہ مانگے جائیں۔

خدا کا شکر ہے کہ حکومت نے ہماری اس اپیل کو منظور کر لیا۔ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حکومت نے کویت سے آنے والے بچوں کو تعلیمی اداروں میں فوری طور پر داخلہ دینے کی ہدایت کی ہے اور اسی سلسلے میں انہیں تبادلہ سرٹیفکیٹ پیش کرنے اور دیگر پابندیوں سے عارضی طور پر مستثنیٰ قرار دیا ہے تاکہ ان کا تعلیمی سال ضائع نہ ہو سکے۔

نئی نسل کے شاندار مستقبل کے لئے آنکھ مچولی کی کوششیں آئندہ بھی جاری رہیں گی۔ انشاء اللہ

مجھ سے ملیے

دشت و صحرا کا رہنے والا ہوں
گرم ملکوں میں پایا جاتا ہوں
قد میں سب بھائیوں سے ہوں اونچا
چھو رہا ہے فلک کو سر میرا
میں زمیں پر ہوں اک بڑی چھتری
سایہ ہوتا ہے میرا کچھ کم ہی
دیکھنے میں ہوں دبلا اور پتلا
پھر بھی مضبوط ہے تنا میرا
میری ہوتی ہے عمر بھی لمبی
اور صحت بھی رہتی ہے اچھی
دور ہوتا ہے کتنا مرا ثمر
مجھ تک آتا نہیں کوئی پتھر
میرا پھل شہد سے بھی میٹھا ہے
ذائقے میں بھی سب سے اچھا ہے
گو عجوبہ سا لگ رہا ہوں میں
پھر بھی مانو گے خوش نما ہوں میں
کھل چکی بات مجھ کو اور نہ چھیڑ
مجھ کو کہتے ہیں سب کھجور کا پیڑ

ان صفحات میں ہم ہر ماہ کسی ایک موضوع کے ساتھ ڈنڈا ڈولی کرتے ہیں
دسمبر کے لیے موضوع ہے "کھلاڑی" جبکہ جنوری کا موضوع ہوگا "بچے"

ڈنڈا ڈولی

ماہِ رواں کا موضوع
"وکیل"

انعامی لطیفہ

نیویارک میں قتل ہوگیا۔ قاتل نے اپنے وکیل کو ٹیلی گرام دیا کہ "میری مدد کو آؤ۔ میں نے آج صبح ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔"

وکیل نے فوراً جواب بھیجا۔ "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں آج شام ہی چند چشم دید گواہوں کے ساتھ پہنچ رہا ہوں۔" (نائلہ بختیار۔ کوہاٹ)

ماسٹر..... اختر تم اس قدر جھوٹ کیوں بولتے ہو؟
اختر..... جناب مجھے بڑے ہو کر وکیل بننا ہے۔
(سید منور یز احمد واسطی)

ایک وکیل نے اپنے مؤکل سے کہا،
"جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو میری خواہش تھی کہ لٹیرا بنوں۔"
یہ سن کر مؤکل صاحب مسکرا کر بولے "جناب آپ وہ خوش قسمت آدمی ہیں جس کی خواہش پوری ہوئی ورنہ اس دنیا میں بہت سوں کی خواہش پوری نہیں ہوتی۔"

ممتاز حبیب صابر، مردان

دو وکیل ایک مقدمے کے دوران بحث میں ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ ایک نے غصے سے کہا۔ "تجھ سے بڑا گدھا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"
دوسرے نے جواب دیا۔ "تجھ جیسا اعلیٰ اور عظیم الشان گدھا بھی دنیا کے کسی حصے میں نہ ہوگا۔"
جج نے میز کو ٹھونکتے ہوئے کہا۔ آرڈر، آرڈر، آرڈر۔ ! تم لوگ شاید بھول چکے ہو کہ میں بھی یہاں موجود ہوں.....!

محمد خالد مغل۔ کراچی

ایک نو آموز وکیل عدالت میں بار بار "میرا بد قسمت مؤکل" کے الفاظ دہرا رہا تھا۔ جیسے جیسے بحث نے طول کھینچا یہ واضح ہوتا چلا گیا کہ نوجوان وکیل قانونی داؤ پیچ بالکل نہیں جانتا اور مقدمہ ہار دے گا۔
چنانچہ جب ایک بار پھر اس نے "میرا بد قسمت

مؤکل" کہا تو جج یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔
"عدالت کو اس سے اتفاق ہے۔ مؤکل واقعی بدقسمت ہے کہ آپ اس کے وکیل ہیں۔"

سید ضیاء الرحمٰن۔ کراچی

ایک وکیل (دوسرے وکیل سے) میرے مؤکل کی حرکت دیکھی۔؟ دوسرا وکیل "کیا ہوا۔؟" پہلا وکیل "میں نے اسے جعلی نوٹوں کے مقدمے میں بری کرایا، وہ کم بخت مجھے فیس میں وہی نوٹ دے گیا۔"

یاسر بن صغیر۔ کراچی

وکیل (گواہ سے) "تم جو کچھ کہو گے سچ کہو گے سچ کے سوا کچھ نہ کہو گے۔ گواہ۔ میں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔

وکیل۔ ۶ اکتوبر کی رات کو تم نے پڑوسی کے گھر سے چیخ کی آواز سنی۔؟۔ گواہ۔ سچ۔ وکیل۔ تم فوراً پڑوسی کے گھر کی طرف بھاگے اور کھلے ہوئے دروازے سے تم نے ایک بچے کی لاش دیکھی۔؟ گواہ۔ سچ۔

وکیل۔ تم قاتل کو جانتے ہو۔ گواہ سچ

وکیل۔ کون تھا۔ گواہ۔ سچ۔

وکیل (غصے سے) تم نے سچ سچ کی کیا رٹ لگا رکھی ہے؟ صحیح صحیح جواب دو۔ گواہ۔ آپ ہی نے کہا تھا کہ سچ کہنا سچ کے سوا کچھ نہ کہنا۔

پروین کنول، خانیوال

عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا، ملزم کے وکیل نے فیصلہ کیا کہ جج کو رشوت دی جائے۔ چنانچہ اس نے سو، سو کے دس نوٹ کتاب میں رکھے اور کتاب جج کی میز پر رکھ دی، جب جج آیا اور ملزم کے وکیل نے دلائل دینے شروع کیے۔ "مائی لارڈ" اس قسم کے

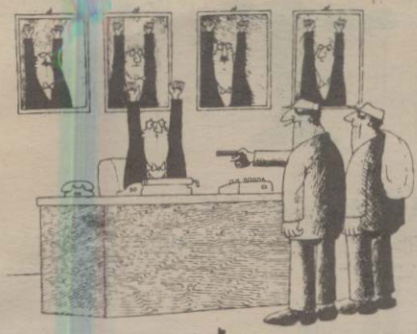

ہیڈ ز اپ

کیس میں ملزم کو کوئی سزا نہیں مل سکتی، کیوں کہ آج تک اس قسم کے چار کیس ہوئے ہیں جن میں ایک مثال آپ کے سامنے رکھی ہوئی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۲۵ پر ہے۔ جج نے کتاب کھولی اور خوش ہوئے، اور کہا، یہ تو ایک مثال ہے ایسی تین مثالیں اور پیش کی جائیں۔

محمد انعام۔ کراچی

وکیل نے اپنے مؤکل کی صفائی میں کہا۔ اس نے صرف اپنی بھوک مٹانے کے لئے پانچ روپے چرائے اور برابر میں دس ہزار کی تھیلی پڑی ہوئی تھی اسے چھوا تک نہیں۔ اس دلیل سے ساری عدالت متاثر ہوئی مؤکل نے رونا شروع کر دیا۔ وکیل نے کہا دیکھئے اسے پانچ روپے چرانے کی کتنی پشیمانی ہے۔ مؤکل نے کہا پشیمانی نہیں مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ دس ہزار کی تھیلی میری نظر سے چُوک گئی۔

سلیم سبز علی، راجوانی

وکیل:۔ (اپنی بیوی سے)! آج اپنے زیورات کی نگرانی کرنا۔

بیوی: کیوں؟

وکیل! آج میں نے ایک چور کو چھڑایا ہے۔ اس لئے شام کو وہ میرا شکریہ ادا کرنے آئے گا۔

سید سجاد احمد۔ پشاور

وکیل: تم نے دنیا میں کوئی نیک کام کیا؟
چور: کیوں نہیں جناب۔ پولیس والوں کا ذریعہ معاش میں ہی تو ہوں۔

یاسمین ناز۔ کراچی

ایک آدمی: (وکیل سے) دیکھئے وکیل صاحب، یہ روپیہ کھوٹا تو نہیں؟
وکیل: ایک روپیہ اور دیجئے
آدمی: (حیرت سے) وہ کیوں؟
وکیل: میرے مشورے کی فیس دو روپے ہے۔

سحاب مشتاق۔ ساہیوال

ایک شخص نے اپنے وکیل سے پوچھا۔ "کیا مقدمے کا فیصلہ اپنے حق میں کروانے کے لئے جج کو تحفہ بھجوانا سود مند رہے گا؟"
وکیل نے اسے بتایا "نہیں نہیں، یہ تو رشوت ہو گی جج توہین عدالت کے جرم میں آپ کو سزا بھی دے سکتا ہے اور ممکن ہے وہ آپ کے بالکل خلاف ہو جائے۔"

چند دن بعد وہ صاحب مقدمہ جیت گئے اور انہوں نے اپنے وکیل سے کہا۔
"معلوم ہوتا ہے میں نے جج کو جو تحفہ بھیجا تھا، اس کا اچھا اثر ہوا ہے۔"
وکیل نے حیرت سے کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے میرے روکنے کے باوجود جج کو تحفہ بھیج دیا۔؟"

ان صاحب نے اطمینان سے مسکرا کر جواب دیا۔ "جی ہاں! لیکن یہ تحفہ میں نے اپنے مخالف کی طرف سے بھیجا تھا۔"

جنید اختر۔ کراچی

مجرم:۔ (اپنے وکیل سے) مجھے یقین ہے کہ

کیا کہا! پولیس کے کہنے پہ چوری کی ہے؟

عدالت مجھے پھانسی کی سزا دے گی لیکن آپ اپنے دلائل سے میری پھانسی کو عمر قید کی سزا میں بدلنے کی کوشش کیجئے گا۔

عدالت نے مجرم کو عمر قید کی سزا دی، جیل میں وکیل اپنے مؤکل سے ملنے گیا تو مجرم نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا۔ وکیل نے مجرم سے کہا۔ تمہارے کیس میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی۔
مجرم نے کہا، "لیکن کیوں۔؟"
وکیل نے جواب دیا اس لئے کہ جیوری کے ممبران تمہیں بری کرنا چاہتے تھے۔ **ندیم شاہد۔ مخدوم پور**

جج:۔ (ملزم سے) "تم کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔"
ملزم:۔ جناب اس سزا سے تو مر جانا بہتر ہے۔"

روبینہ ناز۔ خانیوال

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے کتنے سستے کتنے پیارے

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت اور تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

ذرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں

آنکھ مچولی بذریعہ وی پی ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۳۰۰ روپے

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی سائٹ کراچی

۲۵۰ تحائف مفت حاصل کیجئے

موتی جیسے دانت خوشبو جیسی سانس

یہ تو اُسی وقت ممکن ہے جب آپ باقاعدگی سے دانت صاف کرتے ہوں

ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھی دانتوں کی صفائی کی اہمیت سے کس قدر آگاہ ہیں؟

ہماری مدد کیجئے۔

زیر نظر کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیجئے۔ ہم ۲۵۰ منتخب دوستوں کو (قرعہ اندازی کے ذریعہ) حسین تحائف بھجوانے کا وعدہ کرتے ہیں۔

نام ..... عمر .....

پتہ .....

شہر و ضلع .....

سوالنامہ

سوالنامہ پُر کر کے آپ ہمیں جلد از جلد ماہنامہ آنکھ مچولی کے پتے پر بھجوا دیجئے۔ (آپ کا جو بھی جواب ہو اُس پر ✓ کا نشان لگا دیں)

۱...... آپ دن میں کتنی بار اور کن اوقات میں دانت صاف کرتے ہیں۔ ؟
○ - ہر کھانے کے بعد۔ ○ - رات سونے سے پہلے اور ناشتے کے بعد۔
○ - صبح ناشتے سے قبل۔

۲...... آپ دانتوں کی صفائی کے لئے کیا استعمال کرتے ہیں۔ ؟
○ - ٹوتھ پیسٹ۔ ○ - پاؤڈر۔ ○ - منجن۔ ○ - مسواک۔

۳...... آج کل آپ کے زیر استعمال کون سا ٹوتھ پیسٹ / پاؤڈر یا منجن ہے۔ ؟
نام لکھیئے۔

۴...... آپ کون سا ٹوتھ برش استعمال کرتے ہیں۔ ؟
نہیں کرتے .... نام لکھیئے

۵...... اس سے قبل آپ دانت کس چیز سے صاف کرتے تھے۔ ؟
ٹوتھ پیسٹ، پاؤڈر، منجن یا جو کچھ بھی اسکا برانڈ ہو لکھیئے

۶...... موجودہ زیرِ استعمال ٹوتھ پیسٹ / منجن / پاؤڈر سے آپ کس طرح متعارف ہوئے۔ ؟
ٹی وی اشتہار...... اخبار یا ریڈیو...... کوئی دوست...... محض اتفاقیہ ....

۷...... آپ کو آج کل زیر استعمال ٹوتھ پیسٹ / پاؤڈر یا منجن کیوں پسند ہے۔ ؟
قیمت...... خوبصورتی...... ذائقہ...... خوشبو...... تحفہ...... کچھ اور؟

۸...... آپ ایک ہی ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے ہیں یا بدل بدل کر۔ ؟
ایک ہی...... بدل بدل کر۔

کوپن بھجوانے کا پتہ۔ آنکھ مچولی "جائزہ صحت"۔ ڈی۔ ۱۱۲ سائٹ کراچی نمبر ۱۷

اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کے بارے میں یہ کہانی بھارت کے جناب نیر مسعود نے بھیجی ہے۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار اور محقق ہیں۔ یہ کہانی ہم ان کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

شاہی دعوت

نیر مسعود

میرا بچپن بڑے آرام سے گذرا۔ میرے دادا میر سید احمد لکھنؤ میں چینی کے برتنوں کا کاروبار کرتے تھے اور بہت پیسے والے آدمی تھے۔ شہر میں ان کے چھوٹے بڑے کئی مکان اور باغ تھے۔ دادا کے مرنے کے بعد میرے باپ اور چچاؤں میں جائیداد کے بٹوارے پر جھگڑا ہوا اور سب کاروبار کی فکر چھوڑ چھاڑ کر اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہوگئے۔ یہ بادشاہ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ اس وقت میری عمر سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ اسی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میں اپنے ابا جان کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ مجھے اور میرے بیوی بچوں کو بہت چاہتے تھے، اس لئے ان کی زندگی بھر مجھے خود کمانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ امجد علی شاہ کی حکومت کا آخری سال تھا کہ میرے ابا جان تین دن کی بیماری میں ختم ہوگئے۔ ان کے مرنے کے بعد مجھ پتا چلا کہ وہ قرض لے لے کر ہم لوگوں کو پال رہے تھے۔ اب انہیں قرض دینے والوں نے مجھ کو گھیر لیا۔ ان کا حساب صاف کرتے کرتے یہ حالت ہوگئی کہ میرے پاس شیش محل کے ایک چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے مکان کے سوا کچھ نہ بچا۔ تھوڑے ہی دنوں کے اندر میری بیوی اور پانچوں بچے فاقے کرنے لگے۔ میں نے محنت مزدوری شروع کر دی۔ مگر مزدوری بھی کسی دن ملتی، کسی دن نہ ملتی جس کی وجہ سے اب بھی کسی کسی وقت میرے گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تھا۔

مجھے مزدوری کرتے ایک مہینہ ہو رہا تھا کہ بادشاہ امجد علی کا انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ سلطان عالم

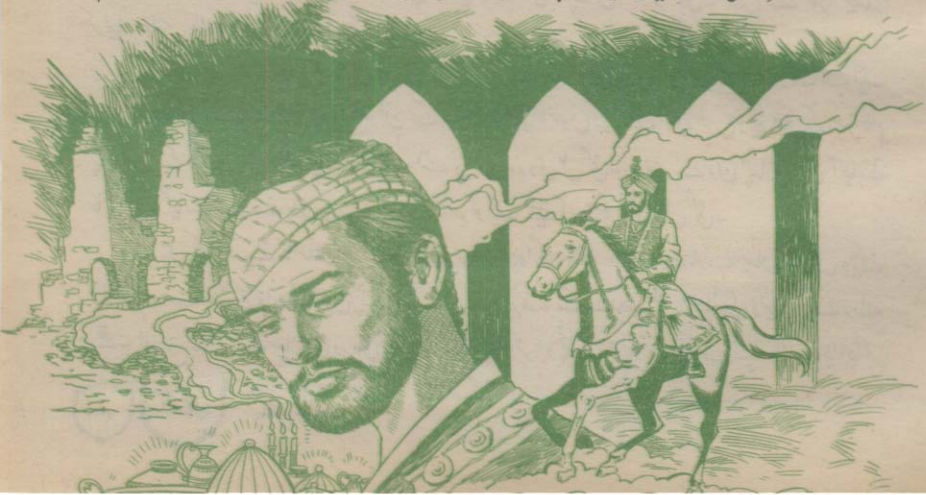

واجد علی شاہ اودھ کے تخت پر بیٹھے۔ انہوں نے بادشاہ ہوتے ہی نئی نئی عمارتیں بنوانا شروع کیں۔ لکھنؤ کے بہت سے رئیس بھی اپنی اپنی حویلیوں اور باغوں کی مرمت اور سجاوٹ میں لگ گئے ان کی وجہ سے شہر میں مزدوروں کی مانگ بڑھ گئی اور مجھ کو قریب قریب روز کام ملنے لگا۔

ایک دن میں کئی مزدوروں کے ساتھ نواز گنج کے ایک باغ میں صفائی کر رہا تھا کہ ڈھول پٹنے اور اس کے بعد کسی اعلان کی آواز سنائی دی۔

"کہیں ڈُگّی پِٹ رہی ہے۔" میں نے اپنے ساتھ کے ایک مزدور مدار بخش سے کہا، "معلوم نہیں کاہے کا اعلان ہے۔"

"تم نے نہیں سنا؟" وہ بولا "کئی روز سے شہر میں جگہ جگہ ڈُگّی پِٹ رہی ہے۔"

"بات کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بادشاہ اپنی فوج بڑھا رہے ہیں۔" سپاہیوں کی بھرتی کے لئے روز ڈُگّی پِٹتی ہے۔"

اس کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ ڈھول کی آواز پھر آئی۔ مدار بخش نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "تم تو ہاتھ پیر کے اچھے ہو۔ بھرتی کیوں نہیں ہو جاتے؟"

مجھے مزدوری کرتے شرم آتی تھی، اور اس میں پیسے بھی کم ملتے تھے۔ میرے بچوں کو کبھی کبھی بھوکا سو جانا پڑتا تھا جس کی وجہ سے بھی کئی دن اداس رہتا تھا۔ مدار بخش کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن مجھے فوج کی نوکری سے ڈر لگتا تھا۔

"نہیں بھائی،" میں نے مدار بخش سے کہا، "اپنی محنت مزدوری کی روزی اچھی ہے۔ فوج میں مارا گیا تو میرے بیوی بچوں کا کیا ہوگا؟"

دوسرے دن مجھ کو کام نہیں ملا۔ خالی ہاتھ گھر لوٹتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آج بھی میرے بچے بھوکے سوئیں گے۔ اتنے میں قریب ہی کہیں سے ڈُگّی پٹنے کی آواز آئی۔ میں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ واپس مڑا اور سیدھا چھاؤنی پہنچ گیا۔

وہاں بڑے زوروں کی بھرتی ہو رہی تھی۔ کئی گھنٹے بعد میری باری آئی اور میں سبز رنگ کے ایک بڑے سے گول خیمے کے اندر بھرتی افسران کے سامنے پہنچا۔ انہوں نے مجھے اچھی طرح دیکھ بھال کر میرا نام پتا، فوج کے سپاہیوں میں لکھ لیا۔ مجھے اسی وقت نئی فوجی وردی مل گئی اور دوسرے دن چھاؤنی میں آجانے کا حکم دیا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مجھ کو ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ مل گئی۔

میں کھانے پینے کا سامان اور مٹھائی لے کر اکڑتا ہوا گھر پہنچا۔ اس دن ہمارے یہاں کا سماں دیکھنے والا تھا۔ سب بچے چڑیوں کی طرح چہکتے ہوئے ایک دوسرے کے منہ میں مٹھائی کی ڈلیاں دے رہے تھے۔ اور جب میں نے سپاہی کی وردی پہنی اور کلّے پھلا کر مونچھوں کو تاؤ دیا تو سب بچے تالیاں بجا بجا کر اچھلنے لگے۔

چھاؤنی کا میدان بہت بڑا تھا۔ میدان کے ایک طرف سپاہیوں کے رہنے کے لئے چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ انہیں میں سے ایک کوٹھری مجھ کو بھی مل گئی۔ ہفتے میں ایک دن چھٹی ملتی تھی۔ میں رات ہی کو اپنے گھر چلا جاتا اور چھٹی کا پورا دن بیوی بچوں کے ساتھ اور محلے والوں میں گذار کر اگلے ہفتے بھر کا کھانے پکانے کا سامان چادر میں باندھتا اور رات ہوتے ہیں چھاؤنی میں پہنچ جاتا۔ فوجی قواعد سورج نکلنے سے پہلے ہی شروع ہو جاتی اور شام تک چلتی تھی۔ دوپہر کو کھانے اور نماز کی چھٹی ہوتی تھی۔ سپاہیوں کو اپنا کھانا خود پکانا ہوتا تھا۔ میں بھی پکاتا تھا۔ کوٹھری کے ایک کونے میں چھوٹا سا چولہا بنا ہوا تھا۔ اسی کے پاس جلانے کی لکڑیاں اور برتن رکھے رہتے تھے۔ میرے پاس سارے برتن مٹی کے تھے، اور تھے ہی کتنے، ایک ہانڈی، ایک کونڈا، ایک رکابی اور گھڑے کا ایک پیندا جو روٹی پکانے کے لئے توے کا کام دیتا اور چولہے کی راکھ بھی میں اسی میں بھر کر پھینکتا تھا۔

میں دوپہر کی چھٹی میں نماز پڑھتا، کھانا پکاتا، ذرا دیر آرام کرتا اور پھر میدان میں آجاتا تھا۔ شام کو قواعد ختم ہونے کے بعد پھر کھانا پکاتا، نماز پڑھتا، کھانا کھاتا، کچھ دیر دوسرے سپاہیوں کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتا اور جلدی ہی سو رہتا۔ دوسرے دن منہ اندھیرے اٹھ کر نماز پڑھتا، رات کے بچے ہوئے کھانے کا ناشتا کرتا اور وردی پہن کر قواعد کرنے پہنچ جاتا۔

صبح سے دوپہر تک قواعد میں بادشاہ بھی شریک ہوتے تھے۔ وہ خود بھی بڑی محنت کرتے اور ہم سپاہیوں سے بھی کڑی محنت لیتے تھے۔ میں نے کئی بار ان کو دیکھا کہ جرنیل کی وردی پہنے، سفید گھوڑے پر سوار میدان میں ادھر ادھر آجا رہے ہیں اور پسینے پسینے ہو رہے ہیں۔ وہ اتنے خوبصورت معلوم ہوتے تھے کہ میرا جی چاہتا تھا کہ ان کو قریب سے دیکھوں۔ اور ایک دن میں نے ان کو قریب سے دیکھ لیا۔

اس دن صبح قواعد کرتے کرتے میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ سویرے آنکھ دیر میں کھلی تھی اس لئے میں جلدی جلدی تیار ہو کر بغیر کچھ کھائے پیئے میدان میں چلا گیا تھا۔ دوپہر کی چھٹی ہوئی بھوک سے میرا بُرا حال تھا۔ اپنی کوٹھری میں آکر میں نے چولہا سلگایا۔ ہانڈی میں ارہر کی دال چولہے پر چڑھا کر آنچ تیز کر دی۔ پھر آٹے کی پوٹلی کھول کر تین چار مٹھی آٹا نکالا اور سخت سخت گوندھ لیا۔ اتنی دیر میں دال میں اُبال آگیا تھا۔ میں نے کاغذ کی ایک پڑیا میں سے نمک کی ایک کنکری اور دو سوکھی لال مرچیں نکال کر ہانڈی میں ڈالیں اور اسے رکابی سے ڈھانک کر چولہے کی آنچ کم کر دی۔ کوٹھری سے باہر کر آکر وضو کیا۔ اب میدان قریب قریب خالی تھا اور سب سپاہی اپنے ٹھکانوں پر جا چکے تھے۔ دور میدان کے دوسرے سرے پر بادشاہ کا بڑا سا رنگین خیمہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے ارد گرد بڑی چہل پہل تھی۔ میں نے کوٹھری میں آکر پھٹی پرانی چٹائی پر نماز پڑھی۔ تسبیح ختم کر کے ہانڈی پر سے رکابی ہٹائی۔ دال خوب گل گئی تھی۔ میں

نے لکڑی کی ایک دھلی کپچی سے دال کو اچھی طرح چلا کر ہانڈی اتار لی۔ چولہے میں دو پتلی لکڑیاں اور لگائیں اور گھڑے کے پیندے کا توا چڑھا دیا۔ جب تک توا گرم ہوا میں نے پڑیا میں سے نمک کی ایک اور کنکری اور دو تین ہری مرچیں لے کر ایک صاف اینٹ پر رکھیں اور دوسری اینٹ سے انہیں کچل کر چٹنی تیار کر لی۔ توا گرم ہو گیا تھا۔ میں نے تین موٹی روٹیاں پکا کر چولہے میں سرخ سرخ سینک لیں۔ کوٹھری میں دال اور گرم گرم روٹیوں کی سوندھی خوشبو بھری ہوئی تھی۔ میں نے روٹیوں کا کونڈا اور دال کی ہانڈی قریب کھسکائی اور کوٹھڑی کے دروازے کی طرف پیٹھ کر کے چولہے کے پاس کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" میں نے کھانا شروع کرنے سے پہلے کہا، لیکن ابھی روٹی تک میرا ہاتھ پہنچا بھی نہیں تھا کہ دروازے کی طرف ایک آواز آئی:

"کہو بھئی سید کیا ہو رہا ہے؟"

"میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے پر بادشاہ کھڑے تھے۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بوکھلاہٹ میں انہیں سلام کرنا بھی بھول گیا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بادشاہوں سے بات کس طرح کی جاتی ہے، اس لئے میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ بادشاہ نے کوٹھری کے اندر نظر دوڑائی اور بولے:

"اچھا کھانے کی تیاری ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ کھانے کے وقت اگر کوئی دوسرا پاس ہو تو اس سے بھی کھانے کو کہا جاتا ہے، لیکن میری سمجھ میں نہ آیا کہ بادشاہ سے یہ بات کیونکر کہوں۔ اس لئے میں اسی طرح چپ چاپ کھڑا رہا۔

"کیا پکایا ہے سیّد؟" بادشاہ نے پوچھا۔ "خوشبو تو بڑی اچھی آ رہی ہے۔"

"حضور ارہر کی دال اور روٹی ہے۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا، اور چٹنی۔"

ارہر کی دال ہم کو بہت بھاتی ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا، "بھئی سید آج ہم کھانا تمہارے یہاں کھائیں گے۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ کوٹھری کے اندر آ گئے۔

اچانک مجھے خیال ہوا کہ میں یہ سب کچھ خواب دیکھ رہا ہوں، اور اس خیال کے ساتھ میری گھبراہٹ کم ہو گئی۔ کم کیا، ختم ہو گئی۔ میں نے دال کی ہانڈی اور روٹیوں کا کونڈا چولہے کے پاس اٹھا کر نماز والی چٹائی پر رکھا دیا۔ بادشاہ بھی اسی چٹائی پر اطمینان کے ساتھ پالتھی سے مار کر بیٹھ گئے۔ میں نے مٹی کی رکابی ان کے سامنے رکھی اور کہا:

"حضور، بسم اللہ۔"

انہوں نے خود ہی ہانڈی میں سے تھوڑی سی دال رکابی میں انڈیلی، کونڈا اپنی طرف سرکایا، روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑا اور دال میں ئل کر منہ میں رکھا۔

"واہ" وہ آہستہ آہستہ نوالہ چباتے ہوئے بولے، "ہمارے باورچی ایسی دال کیوں نہیں پکا پاتے؟ کون کون سے مسالے ڈالے ہیں سیّد؟"

"حضور" میں نے کہا، "بس نمک اور لال مرچ۔"

"بس؟" بادشاہ نے کہا، "ہمارے یہاں تو دال میں بیسیوں چیزیں جھونک دی جاتی ہیں۔ ارہر کا سوندھا پن ہی غائب ہو جاتا ہے۔"

یہ کہتے کہتے ان کی نظر اس اینٹ پر پڑ گئی جس پر میں نے چٹنی بنائی تھی ان کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے وہ اینٹ اٹھا کر رکابی کے پاس رکھ دی۔ بادشاہ نے ایک انگلی چٹنی سے چھو کر زبان پر لگائی۔

"واہ واہ!" انہوں نے چٹخارا بھر کر کہا، "اس میں کیا کیا ہے؟"

"حضور ہری مرچ اور نمک بس۔" میں نے کہا۔

"تم بھئی بڑے کمال کے آدمی ہو سیّد" بادشاہ نے کہا "ہمارے دسترخوان کی نورتن چٹنی کی دھوم ہے، مگر اس میں بھی یہ بات نہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے کوٹھری کے دروازے کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے عجیب سا اشارہ کیا، پھر جھک کر ایک اور نوالہ توڑا۔ میں نے کنکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ میری کوٹھڑی کے باہر کئی فوجی تنے ہوئے کھڑے تھے اور ان کا افسر ایک چتکبرے گھوڑے پر سوار تیزی کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔

بادشاہ نے مشکل سے چار پانچ نوالے کھائے ہوں گے۔ آخری نوالے سے رکابی پونچھتے ہوئے وہ بولے: "سید، ہم نے طرح طرح کے کھانے کھائے ہیں، مگر سچ کہتے ہیں اتنے مزے کا کھانا آج تک نہیں کھایا تھا۔"

میں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ آخری نوالہ ختم کر کے بادشاہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تمہارا کھانا تو ہم نے کھالیا سیّد" انہوں نے کہا "اب تم کیا کھاؤ گے۔"

"حضور نے کچھ بھی نہیں کھایا" میں نے کہا "سب تو یوں ہی رکھا ہوا ہے۔ یہی آپ کی جھوٹن میرے لئے بہت ہے۔"

"نہیں نہیں" انہوں نے کہا "تم چھٹی مناؤ اور گھر جا کر بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئے۔ ذرا دیر میں ایک افسر کوٹھڑی کے اندر آیا۔

"سپاہی میر سیّد علی، تم کو گھر جانے کے لئے ایک ہفتے کی چھٹی دی جاتی ہے" اس نے کہا اور کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں چونکا اور اب مجھے پتا چلا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ بادشاہ سچ مچ

میری کوٹھری میں آئے اور کھانا کھا کر گئے تھے۔ یہ سوچ کر میرے پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے کہ میں نے بادشاہ کو صرف دال روٹی کھلائی تھی، وہ بھی پھٹی پرانی چٹائی پر بٹھا کر۔ اپنے معمولی مہمانوں کے لئے بھی میں صاف ستھرا دسترخوان بچھاتا اور کئی طرح کے کھانے پکواتا تھا۔ مجھے مہمان کی عزت کرنا سکھایا گیا تھا۔ میں خود اپنے مہمانوں کے ہاتھ دھلواتا۔ خود انہیں پانی پلاتا تھا۔ لیکن بادشاہ کے ہاتھ دھلانا کیسا، میں نے تو ان سے پانی تک کو نہیں پوچھا اور وہ میرے دسترخوان سے پیاسے اٹھ گئے۔ جتنا جتنا میں سوچتا گیا، میرا ڈر بڑھتا گیا۔ آخر مجھے یقین ہو گیا کہ ابھی شاہی افسر آئیں گے اور مجھے باندھ لے جائیں گے۔ میں نے سوچا یہاں سے بھاگنا چاہئے۔ بادشاہ نے خود مجھے کو چھٹی دی ہے، پھر خواہ مخواہ رکنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے جلدی جلدی برتن سمیٹ کر دوسرے سامان کے ساتھ گٹھری میں باندھ لئے۔ گٹھری کندھے پر لٹکائی، چٹائی لپیٹ کر بغل میں دبائی، ڈرتے ڈرتے کوٹھری سے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا، چھٹی کا وقت ختم ہو رہا تھا اور سپاہی میدان میں جمع ہو رہے تھے۔ میں لپکتا ہوا چھاؤنی سے باہر آیا اور سیدھا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے بھر میں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔

شیش محل پہنچ کر میں نے دیکھا کہ میرے مکان کی گلی کے سامنے محلے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی سب نے ایک ساتھ کہا "آ گئے، آ گئے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اور میں بھیڑ کو ہٹاتا ہوا گلی میں داخل ہو گیا۔ پوری گلی کیوڑے، زعفران، الائچی اور دوسرے مسالوں کی خوش بو سے مہک رہی تھی۔ میرے مکان کے چھوٹے سے دروازے کے سامنے چاندی کے بڑے بڑے طباقوں سے ڈھکی ہوئی آٹھ دس دیگیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں مکان کے اندر پہنچا تو دیکھا صحن میں میری بیوی اور بچے کچھ حیران، کچھ پریشان کھڑے ہیں۔ میں نے بیوی سے پوچھا۔

"یہ کیا قصہ ہے بھئی؟ گلی میں دیگیں کیسی رکھی ہیں؟"

"آپ ہی بتائیے،" بیوی نے کہا میری تو کچھ سمجھ بھی نہیں آ رہا ہے۔ تھوڑی دیر ہوئی دروازے پر شاہی چوب دار نے آواز دے کر کہا سید صاحب کا کھانا آیا ہے۔ میں نے پوچھا کیسا کھانا، تو کہنے لگا ان کا کھانا حضرت سلطان عالم نے نوش فرمایا ہے اور اپنا خاصہ ان کے لئے بھیجا ہے۔ پھر کئی آدمی پردہ کرا کے اندر آئے اور یہ سب سامان رکھ گئے ہیں۔"

اب میں نے دیکھا کہ صحن میں ایک طرف پتیلوں کی قطار لگی ہوئی ہے، دوسری طرف چینی کے برتنوں کے چھوٹے چھوٹے مینار سے بنے ہوئے ہیں اور سب برتنوں پر سنہرا کام کیا ہوا ہے۔ ان کے قریب ہی شیشے کے اونچے اونچے مرتبانوں میں سیب، انناس، ناشپاتی وغیرہ کے مربے اوپر تک بھرے ہوئے ہیں۔ بلور کی ایک گول اچاری میں نورتن چٹنی ہے۔ ایک چوکی پر پانی سے بھری ہوئی جستے کی صراحیاں

اور چاندی کے بہت سے کٹورے، ایک اور چھوٹی سی چوکی پر سونے کے ورق میں لپٹی پان کی گلوریوں سے بھرے ہوئے دو طشت رکھے ہیں۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا چاندی کے جتنے بھی برتن ہیں سب پر چھوٹے چھوٹے ہیروں کا کام کیا ہوا ہے۔

میں نے بیوی کو چھاؤنی کا قصہ بتایا۔ اتنی دیر میں محلے والے مجھ کو مبارک باد دینے کے لئے دروازے پر اکٹھا ہو گئے تھے۔ ان کو بھی پورا قصہ سنایا اور اسی وقت سب کو کھانے کی دعوت بھی دے ڈالی، لیکن زیادہ تر لوگ دن کا کھانا کھا چکے تھے، اس لئے میں نے محلے کے ہر گھر سے برتن منگوائے اور ہر گھر میں شاہی کھانا بھجوایا۔ رات تک محلے کے ایک ایک گھر میں کئی کئی وقت کا کھانا پہنچ چکا تھا۔ آخر سب دیگیں خالی ہو گئیں اور میں نے محلے والوں کی مدد سے ان میں پانی ابلوا کر انہیں اچھی طرح دھلوالیا۔

دوسرے دن سے شہر کے مشہور رئیسوں کے آدمیوں، مہاجنوں اور دلالوں نے میرے ٹوٹے پھوٹے مکان کے چکر کاٹنا شروع کیے۔ شاہی دعوت کی خبر پھیل چکی تھی اور اب شاہی دسترخوانوں کے برتنوں کے خریدار پیدا ہو رہے تھے۔ انہیں کے ساتھ شاہ گنج کے بھانڈ مبارکبادیاں گاتے، پیر بخارا کے شہدے اول فول بکتے اور مکارم نگر کے ہجڑے تالیاں بجاتے، کمر مٹکاتے انعام وصول کرنے آپہنچے۔ میرے پاس اتنے پیسے کہاں تھے، لیکن بیوی نے میری تنخواہ میں سے بچا بچا کر تھوڑی رقم جمع کر لی تھی، وہ اس وقت کام آگئی اور سب لوگ گاتے بجاتے مجھے دعائیں دیتے چلے گئے۔

مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ شاہی برتنوں کی قیمتیں کیا ہوں گی، لیکن خریداروں نے ان کے جو دام لگائے وہ مجھے اتنے زیادہ معلوم ہوئے کہ میں گھبرا کے رہ گیا۔ خود میرے محلے کے شیخ محمد صدیق صاحب کی یحییٰ گنج میں برتنوں کی دکان تھی۔ شیخ صاحب بڑے اللہ والے آدمی تھے اور میرے دادا کے کاروبار میں ان کے ساجھے دار بھی رہ چکے تھے۔ میں نے یہ سارا معاملہ ان کے ہاتھ میں دے دیا اور انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر سب سامان زیادہ سے زیادہ قیمتوں پر بکوا دیا۔ اس طرح تین دن کے اندر اندر میں ایک رئیس آدمی ہو گیا۔ چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے مفتی گنج میں ایک بڑی حویلی خرید لی، کئی عورتیں مرد نوکر رکھے، حویلی کو سجانے کے لئے سامان منگانا شروع کیا اور سامان کی حفاظت کے لئے دو پرانے سپاہی بھی نوکر رکھ لئے۔

میرے سب جاننے والوں کا کہنا تھا کہ مجھے فوج میں نوکری کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ کو خود بھی اپنی جان قیمتی معلوم ہونے لگی تھی، پھر بھی چھٹی ختم ہوتے ہی میں وردی پہن کر چھاؤنی میں پہنچ گیا۔

...... ○ ......

مجھے چھاؤنی اجڑی ہوئی نظر آئی۔ سپاہیوں کی کوٹھریاں بھی خالی پڑی تھیں۔ البتہ سبز رنگ کے اس

گول خیمے میں، جہاں میری بھرتی ہوئی تھی، کچھ سپاہی آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں خیمے کے اندر پہنچا۔ وہاں میرے ساتھ کا ایک سپاہی بھی ایک طرف کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے آگے بڑھ کر شاہی دعوت کی مبارکباد دی۔

"تمہیں بھی مبارک ہو، سیتارام" میں نے کہا "مگر یہ تو بتاؤ آج یہاں سناٹا کیسا ہے؟"

تم کو نہیں معلوم؟ سیتارام نے کہا، "جتنے سپاہیوں کی بھرتی ہوئی تھی، سب کو الگ کر دیا گیا ہے۔"

"الگ کر دیا گیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا، "کیوں؟ یہ کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا، "سیتارام نے کہا، یہاں کی دھوم دھام دیکھ کر فرنگیوں کو خیال ہونے لگا بادشاہ ان سے لڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ بس، وزیر اعظم سے مل کر بادشاہ کو فوج بڑھانے سے روک دیا۔"

"تو اب بادشاہ یہاں چھاؤنی میں نہیں آتے؟" میں نے پوچھا۔

"چھاؤنی اب کہاں رہی، بھائی سید، " وہ بولا، "اور بادشاہ نے تو محل سے نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ سنا ہے بیمار ہو گئے ہیں، گھنٹوں گم سم بیٹھے رہتے ہیں"۔

"میں اپنے کاموں میں پھنسا ہوا تھا، " میں نے کہا، "مجھے پتا بھی نہیں چلا اور سات دن میں کیا سے کیا ہو گیا۔"

اتنے میں بھرتی افسر نے مجھے اور سیتارام کو پاس بلایا۔ ہم دونوں کے نام اور بھرتی ہونے کی تاریخ پوچھی۔ کاغذوں کے ایک بھاری پلندے میں ہمارے نام ڈھونڈھ کر نکالے اور قلم سے کاٹ دیئے پھر ہم کو ایک ایک پرچہ دیا یہ سرکاری حکم نامہ تھا کہ تم کو فوج کی نوکری سے آزاد کیا جاتا ہے، لیکن تمہاری تنخواہ پہلے کی طرح شاہی خزانے سے ملتی رہے گی۔ پرچہ لے کر میں سر جھکائے ہوئے گھر واپس آ گیا۔

..... ○ .....

میں نے سلطان عالم واجد علی شاہ کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے ان سے اودھ کی حکومت چھین لی اور وہ کلکتے چلے گئے۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں لکھنؤ تباہ ہو گا۔ شہر پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے یہاں کی بہت سی اچھی اچھی عمارتیں گروا دیں۔ انہیں عمارتوں میں میری حویلی بھی تھی۔ اب اس کی جگہ ملبے کا ایک ڈھیر ہے۔

میں دن بھر اس ملبے کے ٹکڑوں کو ادھر سے ادھر کرتا رہتا ہوں جس کی وجہ سے لوگ مجھ کو پاگل سمجھنے لگے ہیں، لیکن میں ملبے کے اس ڈھیر میں مٹی کی اس رکابی کے ٹکڑے ڈھونڈھتا ہوں جس میں اودھ کے آخری بادشاہ نے کھانا کھایا تھا۔

حیرت انگیز کرتب دکھا کر لوگوں کی دلجوئی کرنے والے مائیکل لوزیئر کو دیکھئے۔
پہلے انہوں نے ایک غبارہ پھلایا... پھر اس کمال کے ساتھ وہ غبارے کے اندر داخل ہوئے کہ غبارے کی ہوا ذرا سی بھی باہر نہیں نکلی ...... پھر ایک پن چبھو کر غبارہ پھاڑا اور قہقہہ لگاتے ہوئے باہر آگئے۔ مونٹریال کے رہنے والے لوزیئر اپنی ایسی حرکات سے دنیا بھر کے لوگوں کو خوش کرتے رہتے ہیں دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہونا ان کی خوشی بھی ہے اور پیشہ بھی اس پورے عمل کے ایک ایک پل کی تصویر لینا فوٹوگرافر کا بھی تو کمال ہے۔

غبارے میں داخل ہونے کا منظر

غبارے سے باہر آنے کی جھلکیاں

شعبۂ تحقیق وتلاش آنکھ مچولی

دلدل

حمید کاشمیری

آخری قسط

راشد کا باپ رمضان ڈرائیور ہیروئن پینے کا عادی تھا۔ راشد کو بھی ویڈیو گیم کی لت پڑ گئی تھی۔ وہ گھنٹوں گھر سے غائب رہتا۔ اس کی ماں ان دونوں باپ بیٹوں کی حرکتوں کی وجہ سے پریشان رہتی۔ ایک روز جب راشد حسبِ معمول جب ویڈیو گیم کھیلنے میں مشغول تھا، اُس کی ماں روتی پیٹتی وہاں آئی اور یہ روح فرسا خبر سنائی کہ اُس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد راشد کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اُس نے بُری عادتوں سے توبہ کر لی۔ تعلیم حاصل کرنا تو اُس کے لئے ممکن نہ تھا۔ البتہ گھر کا خرچ چلانے کے لئے اُس نے اپنے والد کے دوست رحمت مستری کی ورکشاپ پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ان دنوں شہر کے حالات کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ آئے دن کے ہنگاموں اور کرفیو کی وجہ سے زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ راشد کا گھر تو بفر زون کے علاقے میں تھا اور ورکشاپ میوہ شاہ قبرستان کے قریب ہر روز آنا جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کسی ممکنہ بُری خبر سے بچنے کے لئے رحمت مستری نے راشد کی والدہ سے بات کر کے راشد کو رات دن مستقل اپنے ورکشاپ پر رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دن بھر تو خوشی خوشی کام کر لیا کرتا تھا لیکن یہ پہلی رات کاٹنا اُس کے لئے مشکل ہو گیا۔ وہ اس آسیب زدہ ماحول میں ڈر رہا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا تھا لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ خوف کی ایک لہر بار بار اُس کے بدن میں بار بار جھرجھری پیدا کر دیتی آخر کار وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اُس کے اُٹھ بیٹھنے سے اس کے ساتھی بھی اُٹھ بیٹھے اور یوں خوفزدہ ہونے پر اس کا مذاق اُڑایا۔ لیکن راشد سچ مچ ڈر رہا تھا۔ اس پر ان لوگوں کی تلقین کا کچھ اثر نہ ہوا اور جب وہ منہ لپیٹ کر سو گئے تو راشد تکیہ اور چادر بغل میں دبا کر ورکشاپ کی چھت پر چڑھ گیا... کافی دیر اِدھر اُدھر کے خیالات اُسے ستاتے رہے۔ پھر وہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا۔ نجانے رات کا کون سا پہر تھا۔ جب وہ ہڑبڑا کر اُٹھا... اُس نے دیکھا کہ چند لوگ میّت گاڑی میں سے اُترے اور ایک میّت کو اُٹھا کر قبرستان کے اندر لے گئے جہاں انہوں نے اس کفن پوش کو ایک تازہ کھُدی ہوئی قبر میں اُتار دیا... لیکن راشد نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ قبر میں اُتاری جانے والی چیز لاش نہیں بلکہ لکڑی کی دو پیٹیاں تھیں۔

صبح سویرے سب سے پہلے اکو کی آنکھ کھلی۔ اُس نے دیکھا تو راشد کو نہ پا کر پریشان ہو گیا۔ اسلم اور گولا بھی جاگ گئے اور انہوں نے راشد کو چھت پر سوتا ہوا دیکھ لیا۔ ان کے جگانے پر راشد نیچے اُترا اور رات کا سارا واقعہ اُنہیں سُنایا، مگر کوئی بھی یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ تینوں نے اس کا خوب مذاق اُڑایا۔ تھوڑی دیر بعد اُستاد بھی در کشاپ پر آگئے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب تھے۔ شاہ جی۔ یہ چاروں شاہ جی ہی کی کار کو ٹھیک کر رہے تھے۔ گولے نے استاد کو بھی راشد کے بارے میں بتایا اور استاد کے پوچھنے پر راشد نے ایک بار پھر رات والا واقعہ دہرایا۔ اسے سُن کر اُستاد سے زیادہ شاہ جی چونکے لیکن بات ٹال گئے۔ گاڑی کی ٹرائی لینے کے لئے شاہ جی اپنے ساتھ راشد کو لے گئے۔ اور راستے میں تمام حالات معلوم کئے۔ راشد نے اُنہیں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ شاہ جی نے اُسے اپنا بنگلہ دکھایا اور کسی بھی ضرورت کے وقت اپنی مدد کا یقین دلایا۔ راشد واپس آکر اپنے کام میں مگن ہو گیا۔ رات کے وقت اُسے کسی ضرورت سے قبرستان جانا پڑا تو واپسی میں عیسیٰ گورکن سے ملاقات ہو گئی۔ عیسیٰ گولے کا باپ تھا۔ اور اُسے بھی راشد کی زبانی رات والے قصّے کا علم ہو چکا تھا۔ وہ اُسے ایک تازہ کھدی ہوئی قبر کے پاس لے گیا اور اُسے زبردستی قبر میں گرا کر اُس پر مٹی ڈالنے لگا۔ باوجود کوشش کے خوف کی وجہ سے راشد کی آواز نہ نکل سکی۔

راشد قبر میں پڑا تھا۔ عیسیٰ گورکن اُسے دھمکیاں دینے کے علاوہ دھیرے دھیرے مٹی اُس کے اُوپر ڈال رہا تھا۔ اُس نے کئی بار کوشش کی کہ چیخے یا زور لگا کر مٹی کے اس ڈھیر سے باہر نکل جائے مگر اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ وہ اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہوا۔ اسے اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔ لیکن پھر قدرت کو اُس پر رحم آگیا۔ عیسیٰ گورکن کی نظر بچتی نوشی کہیں سے اُسے ڈھونڈتی ہوئی اُدھر آنکلی۔ وہ راشد کو زندہ دفن ہوتے ہوئے دیکھ کر حیران اور خوفزدہ ہوئی مگر عیسیٰ نے بات بنائی کہ وہ تو قبر کا ناپ لے رہا تھا۔ نوشی کی وجہ سے راشد کی جان بچ گئی۔ عیسیٰ نے اُسے قبر سے نکالا اور دھمکیاں دے کر بھگا دیا۔ راشد کی کیفیت بڑی عجیب ہو گئی تھی۔ وہ تاریک سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ اب اُسے کسی چیز کا خوف نہیں رہا تھا۔ وہ ایک چائے خانے پر پہنچا۔ اُس نے چائے پینے کے دوران نشہ نہ ملنے کی وجہ سے ایک بوڑھے ہیرونچی کو تڑپتے ہوئے دیکھا۔ وہ دس روپے مانگ رہا تھا۔ راشد نے اُسے دس روپے دیئے تو وہ فوراً نشے کے حصول کے لئے وہاں سے بھاگ گیا۔ اس نشئے کے عادی شخص کا ایک معصوم بچہ جو اُسے گھر لے جانے کے لئے آیا تھا رونے لگا۔ امجد سے گفتگو کے دوران راشد کو پتا چلا کہ امجد کی کہانی بھی بالکل راشد جیسی ہے۔ راشد افسردہ ہوا۔ اور وہاں سے واپس آگیا۔ راستے میں اُسے ایک کار والے نے روکا اور کار میں بٹھا لیا۔ یہ شاہ جی تھے۔ راشد نے شاہ جی کو بھی تمام واقعات سُنائے۔ شاہ جی فوراً عیسیٰ گورکن کے گھر پہنچے اور اُسے دھمکی دی کہ اگر آئندہ اُس نے راشد کو تنگ کیا یا اُس کو کوئی نقصان پہنچایا تو اُس کی خیر نہیں ہوگی۔ ابھی یہ لوگ عیسیٰ کے گھر سے چند قدم دُور ہی گئے تھے کہ کسی جانب سے دو فائر ہوئے اور عیسیٰ خون میں لت پت زمین پر گر پڑا۔

شاہ جی نے فوراً عیسیٰ کو گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال لے گئے۔ لیکن اُس نے رستے ہی میں دم توڑ دیا تھا... اگلے دن ورکشاپ بند تھی۔ سب لوگ عیسیٰ گورکن کے گھر پر جمع تھے۔ بستی کے تمام ہی لوگ وہاں آگئے تھے۔ سارے محلے میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ قاتلوں کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا... شاہ جی اب راشد کی طرف سے فکرمند تھے۔ انہوں نے رحمت مستری اور راشد دونوں کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کی۔ کیونکہ اب راشد ہی واحد چشم دید گواہ تھا جو مجرموں کو پکڑوا سکتا تھا۔ شاہ جی نے راشد کی مدد سے وہ قبر بھی دیکھ لی... قبرستان میں اُن کی ملاقات عیسیٰ گورکن کے مددگار رزاق سے ہوئی لیکن اُس سے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ راشد کا مالی اب کام میں نہیں لگتا تھا۔ اُس نے شاہ جی سے پولیس کی مدد کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اب اُس کے دل میں کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ وہ رات کو بھی باہر ہی سویا۔ پھر رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ جب چند نقاب پوشوں نے اُسے اغوا کر کے ایک بند وین میں سوار کر دیا۔

راشد کے اغوا سے قبرستان کی ساری بستی میں خوف اور دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ شاہ جی اور رحمت مستری الگ سے پریشان تھے۔ رحمت مستری راشد کی تلاش کے سلسلے میں اُس کے گھر بھی گیا لیکن اُس کی ہمت نہ پڑی کہ راشد کی ماں کو راشد کے اغوا کے بارے میں بتا سکتا۔

علاقے کا بڑا آدمی سردار آسمانی بھی شام کو وہاں آیا اور لوگوں کے ایک ہجوم کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اُس نے پولیس کی نااہلی پر تنقید کرتے ہوئے عوام کی جان و مال کے تحفظ کی ضرورت پر زور دیا۔

راشد کو اغوا کر کے جس جگہ لے جایا گیا وہ ایک گودام تھا جہاں مختلف قسم کی چیزیں ذخیرہ کی گئی تھیں، اُن اشیاء کا معائنہ

کرتے ہوئے راشد کو ہیروئین کے بھی بہت سے تھیلے نظر آئے۔ اُس نے تھوڑی سی ہیروئن اپنے لباس میں چھپالی۔ اس کے علاوہ اُس نے کافی مقدار میں پسی ہوئی مرچوں کی ایک پڑیا بنا کر اپنے نیفے میں اُڑس لی۔

اگلی صبح اُس گودام میں راشد نے سردار آسمانی کو دیکھا جو اپنے ماتحتوں سے "مال" کے لانے لے جانے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اُس نے راشد کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے اُسے طرکاروں کے حوالے کر دیا جو اُسے ایک ٹرک میں ڈال کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

تقریباً چار گھنٹے چلنے کے بعد ٹرک ایک سنسان پہاڑی علاقے میں رُک گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ وہ لوگ ناشتا کرنے کے لیے رُکے تھے۔ راشد کو بھی ناشتا دیا گیا۔ یہ اچھا موقع تھا اور راشد نے اُس سے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ اُس نے بڑی چالاکی سے معصوم سی صورت بنا کر اور خوفزدہ ہونے کی اداکاری کر کے اغوا کنندگان کو مجبور کیا کہ وہ اس کے پاؤں بھی کھول دیں تاکہ وہ ضروری حاجات سے فارغ ہو جائے۔ بدمعاشوں نے سوچا کہ وہ تعداد میں چار ہیں اور اسلحہ بھی اُن کے پاس ہے۔ یہ چھوٹا بچہ بھاگ کر کہاں جائے گا لیکن پاؤں کھلتے ہی راشد نے بڑی مہارت اور پھرتی کے ساتھ چاروں کی آنکھوں میں مرچیں جھونک دیں اور وہاں سے فرار ہو کر ایک کاروالے کی مدد سے اپنے گھر پہنچ گیا۔ جہاں مستری رحمت اور شاہ جی اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

"یہ ہے تمہارا کمرہ" شاہ جی نے راشد کو اپنی کوٹھی کا کمرہ دکھاتے ہوئے کہا "اس میں کتابیں ہیں ریڈیو ہے ٹی وی ہے فریج رکھا ہے جس میں ٹھنڈا پانی اور کھانے پینے کی اور چیزیں ہیں۔ انہوں نے فریج کا دروازہ کھول کر دکھایا اور بولتے چلے گئے اپنے باتھ ہے اور یہ دروازہ باہر گارڈن میں کھلتا ہے اگر جی گھبرائے تو گارڈن میں چلے جانا اس کے علاوہ پوری کوٹھی میں تم آ جا سکتے ہو کوئی ممانعت نہیں۔ میری فیملی تمہارا خیال رکھے گی لیکن تم کوٹھی سے باہر نہیں نکلو گے۔ کچھ عرصے تک تمہیں اب اسی گھر میں رہنا ہو گا۔"

"جی سر....." راشد نے شاہ جی کی لمبی چوڑی ہدایت کے جواب میں صرف "جی سر" کہہ کے رضامندی سے سرہلا دیا لیکن راشد کی ماں اب کسی طرح راشد کو جدا کرنے کے لئے تیار نہیں تھی وہ گھر سے نکلتے وقت راشد سے لپٹ گئی تھی اور کہہ رہی تھی بیٹے کو اب کہیں نہیں جانے دوں گی لیکن شاہ جی نے بڑی مشکل سے راشد کی ماں کو سمجھایا کہ راشد کی زندگی اب خطرے میں ہے اور اس کا اپنے گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ مستری رحمت نے بھی اس سمجھایا اور بالآخر راشد کی زندگی ہی کی خاطر وہ اسے جدا کرنے پر رضامند ہوئی اور اب راشد شاہ جی کے گھر میں تھا اور شاہ جی راشد کی مدد سے اسمگلروں اور دہشت گردوں اور منشیات فروشوں کو پکڑنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ قبر کو کھولنے کا پروگرام انہوں نے منسوخ کر دیا تھا کہ یہ بات ان کے علم میں آچکی تھی کہ قبر میں چھپائی ہوئی اشیاء منشیات فروشوں نے خفیہ طور پر راتوں رات نکال لی ہیں۔

"کیا تمہیں یقین ہے راشد کہ جو شخص منشات فروشوں کے سرغنہ کے روپ میں خفیہ اڈے پر

آیا تھا وہ سردار عمر آسمانی ہی تھا؟" شاہ جی نے اپنے منصوبے کا کچھ نقشہ بناتے ہوئے راشد سے دریافت کیا۔

"جی سر..... اس میں کوئی شبہ ہی نہیں۔" راشد وثوق سے بولا "میں ان کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"لیکن سر....." راشد کچھ کہنے لگا لیکن پھر کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"بولو بولو۔ کیا بات ہے" شاہ جی نے حوصلہ افزائی کے لہجے میں پوچھا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا سر کہ ہے اچھا آدمی" راشد نے جواب دیا۔

"کون سردار....." شاہ جی نے حیرت سے پوچھا اور راشد نے اثبات میں سر ہلایا اس پر شاہ جی نے ایک زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے مزید پوچھا، "یہ کیسے خیال آیا تمہیں کہ سردار اچھا آدمی ہے؟"

"وہ یوں سر کہ وہ چاہتا تو مجھے مار بھی سکتا تھا" راشد نے خیال ظاہر کیا "کیوں کہ گینگ کے دوسرے لوگ مجھے مارنا چاہتے تھے لیکن سردار کے حکم پر مجھے زندہ رکھا گیا۔"

"تم پاگل ہو....." شاہ جی نے راشد کی سادگی پر پھر قہقہہ لگایا۔ "تمہاری موت سے سردار کو کچھ فائدہ نہیں تھا اس نے بیگار کیمپ والوں کے ہاتھ تمہیں زندہ فروخت کر کے ٹھیک ٹھاک رقم وصول کی ہوگی۔" راشد خاموشی سے سنتا رہا اور شاہ جی بولتے چلے گئے، معلوم ہے تم اگر اس دوسرے گروہ کے اڈے پر پہنچ جاتے تو تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا؟"

"راشد آگے سے کچھ نہیں بولا فقط ایک سوالیہ نشان بن گیا اور شاہ جی اس کا تجسس ختم کرتے ہوئے بولے "وہ لوگ پہلے بچوں کو ذہنی اور جسمانی طور پر معذور کر دیتے ہیں اس طرح معذور کرتے ہیں کہ بچہ اپنی یاداشت کھو بیٹھتا ہے۔ شناخت نہیں کر سکتا اپنے والدین تک کو۔ اپنا نام بھی اسے یاد نہیں رہتا اور پھر اس کو بے بس کر کے بھیک مانگنے کے لئے سڑکوں پر چھوڑ دیتے ہیں اور اسے کھانے کو محض اس لئے دیتے ہیں کہ وہ زندہ رہ سکے۔" شاہ جی کی بات سن کر راشد کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس نے خوف سے ایک جھرجھری سی لی۔

"لیکن اب تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں تم محفوظ ہو اور محفوظ ہاتھوں میں ہو اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمہیں نئی زندگی ملی ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔" راشد نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا اور شاہ جی اس کا خوف دور کرنے کے لئے باہر گارڈن کی تازہ ہوا میں لے گئے اور وہاں باتیں کرنے لگے۔

"یہ بتاؤ تم اس اڈے تک پہنچ سکتے ہو کیا؟" شاہ جی نے قدرے توقف سے پوچھا یا کوئی اس کی نشاندہی کر سکتے ہو جس سے پولیس کو وہاں تک پہنچنے میں مدد ملے۔"

"سر بات یہ ہے کہ آنکھوں پر پٹی ہونے کے باوجود مجھے پورا اندازہ ہے کہ وہ لوگ کس راستے سے اور کہاں تک گئے تھے" راشد محسوسات پر زور دیتے ہوئے بولا۔"میرے اندازے سے وہ سپر ہائی وے کی طرف مجھے لے گئے تھے پھر مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ کہاں سے انہوں نے گلشن کی طرف ٹرن لیا مین یونیورسٹی روڈ پر گئے اور کہاں سے اندر گلی کی طرف مڑے مجھے یہ بھی اندازہ ہے اور مجھے وہاں تک پہنچنے کے ٹائم کا بھی اندازہ ہے کیوں کہ میں سیکنڈوں کے حساب سے راستے بھر گنتی کرتا رہا ہوں۔سر مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو وہاں تک پہچا سکتا ہوں۔"

ویری انٹیلی جینٹ ....." شاہ جی نے داد دی۔

"لیکن ....." راشد کچھ کہتے کہتے اٹکا۔

"کیا لیکن ....." شاہ جی نے پوچھا۔

"سر حیرت کی بات ہے کہ راستے میں ایک مقام پر سمندر یا دریا کی لہریں بھی آئی تھیں اور یہ لہریں صرف کلفٹن کی طرف آسکتی ہیں۔" راشد تشویش سے بولا "گلشن کی طرف نہیں ہے سمندر یا دریا۔"

"کہیں کلفٹن کی طرف ہی تو نہیں لے گئے تھے؟" شاہ جی نے تذبذب میں پوچھا۔

"نہیں سر ..... وہ کلفٹن ہرگز نہیں تھا" راشد یقین سے بولا "مگر لہریں ....."

"تم اپنا مائنڈ ٹھیک کر لو پہلے ....." شاہ جی اسے تھپکاتے ہوئے بولے۔

"ٹھیک ہے سر آپ فکر نہ کریں میں آپ کو لے چلتا ہوں" وہ ایک عزم کے ساتھ بولا "مجھے یقین ہے ہم ضرور اس جگہ تک پہنچ جائیں گے۔"

"تو پھر ہم آج ہی چلتے ہیں ہماری پولیس فورس تیار ہے۔" شاہ جی جیسے راشد کے ارادے کے انتظار ہی میں تھے۔

"لیکن سر رات کو چلیں گے۔ اور اُسی وقت۔" راشد نے رائے ظاہر کی۔

"وہ کیوں؟ ....." شاہ جی نے پوچھا۔

"اس لئے سر ....." راشد بولا "رات کو سگنل کھلے ہوں گے سڑکوں پر ٹریفک نہیں ہوگا اور میری گنتی کا حساب بھی غلط نہیں ہوگا ..... اور ہمارے اندازے درست ہوں گے ہم بھٹکیں گے نہیں"

"ویری گڈ....." شاہ جی نے راشد کی پیٹھ تھپکا کر داد دیتے ہوئے کہا۔"ہم تمہیں آزمارہے تھے ورنہ ہمارا ارادہ ہی رات کو نکلنے کا تھا ہم تمہارے اغوا کا ڈپلی کیٹ کرنا چاہتے ہیں رات اسی وقت اسی مقام سے گاڑی کی اسی رفتار کے ساتھ ۔ اب ہم کو دیکھنا ہے کہ تم ہم کو کس حد تک مایوس نہیں کروگے۔"

"میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا....." وہ مصمّم ارادے سے بولا۔

"تم سے ہم نے بہت امید لگا رکھی ہے راشد....." شاہ جی نے پدرانہ شفقت سے راشد کو دلاسہ دیا اور پروگرام طے کر کے چلے گئے۔

.....○○○○.....

"اگلے دن نصف رات کے وقت پولیس کی ایک نفری ایک پک اپ وین میں راشد کو ساتھ لے کے مستری رحمت کے کارخانے سے کھوج لگانے کی مہم پر روانہ ہوئی۔ جتھے کی قیادت خود شاہ جی کر رہے تھے۔

"لو راشد میاں یوں سمجھ لو کہ تم اغوا ہوگئے ہو....." گاڑی روانہ ہونے سے قبل شاہ جی نے آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے سر میں آنکھیں بند کرتا ہوں سمجھ لیں میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ گاڑی کو نیچے اتار کے دائیں طرف لیں "راشد نے بھی جیسے ایک گائیڈ کی طرح کہا۔

"گاڑی نیچے اتر کر دائیں جانب کو مڑی اسپیڈ بریکر چونکہ لگے ہوئے تھے لہٰذا گاڑی کو رفتار وہی تھی جو کہ اغوا کرنے والی گاڑی کی تھی راشد نے آنکھیں بند کر کے دل میں گنتی شروع کر دی پھر جہاں چھوٹے روڈ کا بڑے روڈ سے ملاپ ہوا اور گاڑی لمحہ بھر کو رکی تو راشد نے ڈرائیور کو دائیں جانب مڑ جانے کا اشارہ دیا اور گاڑی خود کار طریقے سے مڑ گئی۔

"اسپیڈ تھوڑی سی تیز کریں....." راشد نے ہدایت دی اور یہ جملہ بولتے وقت اس نے اپنی انگلیوں پر گنتی جاری رکھی تاکہ اس کی گنتی کا حساب درست رہے گاڑی چلتی رہی اور گرُو مندر کے چوک پر جب پہنچی تو راشد کی آنکھیں بند ہی تھیں۔

"کیا گرُو مندر آگیا؟" راشد نے پوچھا وہ اپنے اندازے کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

"ہاں..." شاہ جی نے کہا اور راشد نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں کھول کر باہر تاریکی میں جھانکا اور آنکھیں بند کرلیں۔

"اب دائیں کولالو کھیت والے روڈ پر لے لیں۔" اُس نے مزید ہدایت دی۔

"اور یہاں سے گاڑی تقریباً نوے اور سو کلو میٹر کی رفتار پر رکھیں" راشد نے بولتے ہوئے حسب سابق گنتی انگلیوں پر جاری رکھی اور حساب میں گڑبڑ نہیں ہونے دی گاڑی نوے اور سو کی رفتار سے دوڑنے لگی۔

"کیا اس رفتار سے تمہاری گاڑی کو راستے میں پولیس نے کہیں چیک نہیں کیا تھا؟" شاہ جی نے ازراہِ معلومات پوچھا۔

"نہیں سر پولیس نے کسی جگہ چیک نہیں کیا تھا۔" وہ اپنی گنتی جاری رکھتے ہوئے بولا اور پھر پولیس کی بھری ہوئی وین کے باوجود گاڑی میں مکمل سناٹا رہا وین فراٹے بھرتی دوڑتی رہی۔

"راستے بھر مکمل خاموشی طاری رہی اور وین بھرپور رفتار سے چلتی رہی پھر اچانک ایک جگہ پہنچ کر راشد چونکا۔

"رک جائیں....." گاڑی رک گئی تو راشد نے پوچھا "یہ کون سی جگہ ہے"۔

"یوسف پلازہ....." شاہ جی نے جواب دیا وہ اس وقت یوسف پلازہ سے کچھ آگے نکل آئے تھے راشد کچھ تھوڑا پریشان ہو گیا جیسے بھنک گیا ہو شاہ جی نے راشد کو پریشان دیکھا تو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ٹائم آوٹ لے کر گنتی روک دو اور اچھی طرح سوچ بچار کر لو....."

"ایک منٹ....." راشد نے گنتی روک کر کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر باہر کی طرف جھانک کر اس نے پوچھا "یہاں پر کوئی رائٹ ٹرننگ ہے کیا؟"

"ہاں ایک ٹرننگ وہ آگے اور ایک پیچھے رہ گئی ہے۔" شاہ جی نے جواب دیا۔

"گاڑی پیچھے لے لیں اور اس ٹرننگ سے اندر چلیں راشد نے کچھ سوچ کر مشورہ دیا گاڑی ریورس میں پیچھے گئی اور ٹرننگ سے اندر مشرق کی جانب مڑ گئی راشد نے پھر آنکھیں موند لیں اور گنتی گننے لگا گاڑی راشد کی رہنمائی پر دوڑتی ہوئی گلشن کے مین روڈ پر پہنچ کر آگے ہی آگے نیپا چورنگی سے بھی آگے سیدھی اسٹیڈیم روڈ پر پہنچ گئی۔

"رک جائیں....." راشد نے گنتی روکی اور گاڑی کو رکنے کی ہدایت کی۔

"کیا بات ہے؟" شاہ جی نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ہم غلط آگئے ہیں۔" راشد تشویش سے بولا۔"اس گنتی پر پہنچ کر مجھے سمندر کی لہروں کی آواز سنائی دی تھی۔

"میں نے اسی لئے کہا تھا کہ پہلے اچھی طرح سمت مقرر کر لو پھر روانہ ہوں گے۔" شاہ جی نے قدرے الجھن سے کہا۔

"ٹھہریئے..........." راشد چونکا۔

"یہ باہر شور کیسا ہے..........." اس نے اندھیرے میں سامنے کھلے میدان کی طرف جھانک کر پوچھا جہاں رات کے وقت بہت سے مزدور کئی کدالیں ہتھوڑے لئے ٹھکاٹھک کام کرنے میں مصروف تھے۔

"پانی کی پائپ لائن درست ہو رہی ہے دو دن پہلے یہ پائپ اچانک پھٹ گیا تھا۔" شاہ جی نے بتایا۔

"کیا اس کا پانی میدان میں بہہ گیا تھا..........." راشد نے تجسّس سے پوچھا۔

"وہ تو ایک سیلاب آ گیا تھا..........." شاہ جی بولے

"سیلاب..........." راشد پھر چونکا "لہریں" وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا "اس کا مطلب ہے پانی کی وہ لہریں اسی پائپ لائن کے پھٹنے کی تھیں اور وہی آواز تھی جس کو میں سمندر کی لہریں..........." وہ کہتے کہتے رکا۔

"گڈ گڈ گڈ.......... یہ پائپ لائن اسی رات کو پھٹی ہے اور پانی اس وقت لہروں کی شکل میں بہہ رہا تھا۔" شاہ جی نے بہت امید افزا لہجے میں رائے دی۔

"گاڑی آگے بڑھایئے ...." راشد تجسّس اور اضطراب کی ملی جلی کیفیت میں بولا

گاڑی آگے بڑھی اور راشد نے آنکھیں بند کر کے گنتی وہیں سے شروع کی جہاں توڑی تھی کچھ دور جا کر اس نے پھر رکنے کو کہا گاڑی پھر رکی تو شاہ جی نے پوچھا۔

"کیا بات ہے راشد؟"

"سر ہم ٹھیک جگہ پر آ گئے ہیں..........." راشد نے زور سے ناک سے سانس اوپر کھینچ کر خوشبو کو سونگھا جو باہر بنگلے کے اطراف لگی رات کی رانی سے آ رہی تھی۔

"سر یہ رات کی رانی کی خوشبو..............." اسی نے گنتی روک کر باہر جھانکا۔

"یہ اس بنگلے سے آ رہی ہے" شاہ جی نے رہنمائی کرتے ہوئے پاس ہی بنگلے کی طرف اشارہ کیا۔

"سر اس بنگلے سے ذرا ہی آگے کوئی گلی اندر جاتی ہے جہاں سے ہماری گاڑی مڑ گئی تھی۔"

راشد نے اپنی یاد داشت پر زور دے کر کہا۔

"وہ رہی گلی آگے....." شاہ جی نے رہنمائی کی۔

"اسی گلی میں مڑ جایئے سر۔" راشد نے ہدایت دی۔

"کرم علی بائیں ہاتھ کو گلی کے اندر چلو۔" شاہ جی نے ڈرائیور کو حکم دیا گاڑی اندر مڑی تو راشد تجسّس میں بولا "سر ہم اس جگہ کے بالکل قریب آ گئے ہیں۔"

"شاباش....." شاہ جی نے ارشد کو تھپتھپایا۔

"رک جایئے....." کچھ کتے بھونکے تو راشد ایک دم چونکا "سر یہی جگہ ہے وہ" راشد کا دل دھڑکنے لگا۔

"کتوں والا بنگلہ؟" شاہ جی نے پوچھا۔

"نہیں سر....." اُس نے قیافہ لگاتے ہوئے کہا "کتوں والے بنگلے سے تقریباً بیس گز آگے ہماری گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہو گئی تھی ..... کسی اور بنگلے میں۔"

"کتوں والے بنگلے سے آگے صرف ایک بنگلہ ہے کونے کا وہ تنہا بنگلہ" شاہ جی نے صورتِ حال کا جائزہ لے کر کہا۔

"جی سر..... وہی بنگلہ ہے کونے والا اکیلا بنگلہ" راشد یقینی لہجے میں بولا گاڑی اوٹ میں رکی ہوئی تھی شاہ جی نے اپنے جونیئر اسٹاف سے کچھ مشورہ کیا اور ڈرائیور کرم علی کو حکم دیا کہ گاڑی کو آگے لے جائے اور دور کسی ایسی جگہ روک دے جہاں سے بنگلے کی نگرانی ہو سکے لہٰذا گاڑی آگے بڑھی ایک بنگلے کے گیٹ کے اوپر خطرناک قسم کے بلڈ ڈوگز بندھے ہوئے تھے جو گاڑی دیکھ کر زیادہ بھونکنے لگے گاڑی آگے نکل گئی اور کونے والے بنگلے کے سامنے ایک تاریک تنگ گلی کے اندر داخل ہو گئی اور ایک جگہ درختوں کے جھنڈ میں کھڑی ہو گئی جہاں سے کونے والا بنگلہ اوٹ میں بھی تھا اور بالکل سامنے بھی دکھائی دے رہا تھا۔

"گاڑی موڑ کر روکو....." شاہ جی نے ڈرائیور کو حکم دیا اور ڈرائیور نے گاڑی موڑ کر اس طرح روکی کے اس کا رخ سیدھا بنگلے کی طرف ہو گیا پولیس کے سارے سپاہی شاہ جی، شاہ جی کا ماتحت افسر، ڈرائیور اور راشد سب چوکس ہو گئے۔

"سر اس بنگلے میں گھس جائیں آپ....." راشد نے مشورہ دیا "یہ بالکل وہی جگہ ہے"

"دیکھو راشد....." شاہ جی سنجیدہ لہجے میں بولے "کسی بنگلے میں گھس جانا یا اس کی

تلاشی لینا کوئی آسان بات نہیں۔

"یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ پولیس کو سو فیصد یقین نہ ہو جائے کہ وہ صحیح جگہ ہاتھ ڈال رہے ہیں۔"

"میں آپ کو سو فیصد یقین دلاتا ہوں سر.........." راشد نے بے چینی لیکن یقین سے کہا۔

"لیکن ہمیں انتظار کرنا ہو گا.........." شاہ جی نے چوکس ہو کر دور بین کی طرح نگاہیں بنگلے پر لگا دیں انہوں نے کچھ ہی دیر بنگلے کی نگرانی کی ہو گی کہ اچانک ایک کار کونے والے بنگلے کے سامنے آن رکی اور رکتے ہی اس نے اوپر نیچے دو مرتبہ لائٹ سے سگنل دیا۔ سگنل دینے کی دیر تھی کہ اندر سے گیٹ کی کنڈی کھلنے کی آواز آئی لیکن گیٹ کھلا نہیں جین اور شرٹ میں ملبوس ایک مضبوط جسم والا آدمی پھرتی کے ساتھ کار سے باہر نکلا اور گیٹ کھولنے کے لئے آگے بڑھا راشد چونک پڑا۔

"سر وہی ہے یہ جو میری نگرانی پر تھا۔"

"شیور.........." شاہ جی بھی چونکے۔

"جی سر.........." راشد سو فیصد یقین کے ساتھ بولا "اور یہ وہی آدمی ہے جو اس رات کو قبرستان میں قبر کے اندر مال دفن کرنے والوں کی نگرانی کر رہا تھا۔

"کرم علی.......... چوکس رہنا" شاہ جی مزید چوکنے ہو کر بولے۔

"جونہی گیٹ کھلنے پر یہ کار اندر جائے اس کے ساتھ ہی وین اندر لے جانا بڑی ہوشیاری کے ساتھ۔" انہوں نے ایک دلیرانہ حکم دیا "رکنا نہیں گاڑی کو گاڑی کے ساتھ جوڑ کر اندر لے جانا"

"جی سر.........." ڈرائیور چوکس ہو گیا اور جونہی اگلی کار اندر گئی تو پولیس کی وین پیچھے پیچھے گیٹ بند ہونے سے پہلے اس طرح شوٹ کر کے اندر آئی جیسے کوئی چیتا کچھار سے شکار پر جھپٹتا ہے۔ پولیس کی دوسری گاڑیاں تعاقب میں تھیں جنہوں نے بنگلے کو چاروں طرف سے گھیر لیا منشیات فروشوں اور اسمگلروں کی بد نصیبی اور پولیس کی خوش نصیبی تھی کہ اس وقت بنگلے کے اندر ایک اہم میٹنگ ہو رہی تھی اور سردار عمر آسمانی بہ نفسِ نفیس اس میٹنگ میں موجود تھے پولیس کا حملہ اور چھاپہ اتنا اچانک تھا کہ کسی کو فرار ہونے کا موقع نہ ملا کچھ دیر تک مجرموں نے پولیس سے مقابلہ کیا مقابلے میں ایک مجرم ہلاک ہو گیا دو پولیس والے زخمی ہو گئے لیکن لڑائی نے زیادہ طول نہیں کھینچا پولیس نے تھوڑے سے مقابلے کے بعد مجرموں پر بھی قابو پا لیا اور کروڑوں روپے کی مالیت کی ہیروئن کو اپنے قبضے میں کر لیا اگلے دن اخباروں میں پولس کے اس چھاپے کی اور چھاپے کے نتیجے میں منشیات فروشوں

اور ان کے سرغنہ سردار آسمانی کی گرفتاری کی شہ سرخیاں شائع ہوئیں۔

"سردار صاحب نے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے اپنا اثرورسوخ استعمال کرنا شروع کیا لیکن شاہ جی نے اس معاملے کو اپنا اور پولیس کے وقار کا مسئلہ بنالیا اور افسران بالا پر واضح کر دیا کہ اگر سردار کو چھوڑ دیا گیا تو وہ مستعفی ہو کر مسئلے کو پریس میں اور عوام کے سامنے لے جائیں گے۔

"راشد روپوش ہو گیا اور اس دن کے بعد سے مستری رحمت کے کارخانے پر نہیں گیا اور زیادہ تر وقت وہ گھر میں ہی گذارتا تھا اور اس کی ماں بھی اب اسے گھر سے نکلنے نہیں دیتی تھی اور کچھ رشتہ داروں کی مدد سے خفیہ طور پر کوشش کر رہی تھی کہ راشد کو کسی طرح بیرون ملک نوکری مل جائے تاکہ وہ ملک سے باہر چلا جائے۔

"نہیں بہن راشد ملک سے باہر نہیں جائے گا" ایک دن شاہ جی اچانک مستری رحمت کے ساتھ راشد کے گھر آئے اور راشد کی ماں سے کہنے لگے "راشد تو قوم کے ان سپوتوں میں سے ہے جن کی اپنے ملک کے اندر سخت ضرورت ہے۔

"دیکھو بہن جی جہاں تک خطرے کا تعلق ہے تو وہ انسان کے لئے ہر جگہ ہے اور کسی جگہ بھی نہیں ہے۔" شاہ جی نے دلیل دیتے ہوئے کہا۔

"اس گروہ کے تمام لوگ پکڑے گئے ہیں بہن یہاں تک کے ان کا لیڈر بھی اندر ہے اور ان سب کو لمبی سزائیں ہو گئی ہیں۔" اب کے مستری رحمت بولے "اور پھر آپ راشد کو ہمیشہ تو گھر میں بند نہیں رکھ سکتی ہیں۔"

"میں گھر میں بند رہنا بھی نہیں چاہتا ہوں استاد..... یہ تو سر کا حکم تھا جس کی وجہ سے میں گھر سے نہیں نکلا راشد بڑی دلیری سے سینہ تان کر بولا۔

"شاباش بیٹے....." شاہ جی نے راشد کو تھپکی دی "تم جیسے نوجوان پر پوری قوم کو فخر کرنا چاہئے میں آج تمہارے لئے ایک خوشخبری لے کر آیا ہوں۔

"خوشخبری....." وہ چونکا "کیسی خوشخبری سر؟"

"تم پہلے وعدہ کرو کہ ملک سے باہر نہیں جاؤ گے اور کل سے مستری رحمت کے ساتھ گیراج پر ہاتھ بٹاؤ گے" شاہ جی نے شرط لگائی۔

"میں بالکل باہر نہیں جانا چاہتا سر میں اپنے ہی ملک میں روکھی سوکھی کھانا چاہتا ہوں لیکن اماں....." اس نے فرمانبرداری سے ماں کی طرف دیکھا۔

"اگر تمہارا یہ ارادہ ہے تو میں بھی ممتار کھی ہوں بیٹے اور تمہیں زبردستی اپنی آنکھوں سے اوجھل ہزاروں میل دور نہیں بھیجنا چاہتی....." ماں نے رضاکارانہ انداز میں سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"میری بہت اچھی ماں۔" راشد ماں سے لپٹ گیا اور پھر شاہ جی سے بولا اب خوشخبری سنادیں سر۔

"خوشخبری یہ ہے بیٹے کہ....." شاہ جی نے بینڈ بیگ کھولا ان کے چہرے پر خوشی اور فخر کے جذبات امڈ آئے انہوں نے بیگ سے کچھ کاغذات نکالے اور بڑے فخر سے بولے۔

"ہم نے تمہاری جرأت اور بہادری کے لئے محکمہ سے تمہارے لئے ایوارڈ کی درخواست کی تھی جس پر ہمدردی سے غور ہوا اور حکومت کی جانب سے تمہارے نام اعلیٰ کارکردگی کی یہ سند جاری ہوئی اور اس کے ساتھ یہ پچاس ہزار روپے کی رقم کا نقد انعام۔" شاہ جی نے ایک چیک راشد کو پیش کرتے ہوئے کہا راشد نے چیک کو آہستگی سے چھوا اور پڑھا اور بڑے ادب سے ماں کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ماں کے چہرے پر خوشی وفخر اور مسرت کی لہر دوڑ گئی دیکھتے دیکھتے اسے ننھا سا راشد کسی تناور درخت کی طرح اونچا مضبوط اور پُربہار دکھائی دینے لگا اور اس درخت کے پھلوں اور پھولوں کی مہک جیسے سارے گھر میں رچ بس گئی۔

(ختم شد)

جہانِ نو

محمد صالح ارشاد

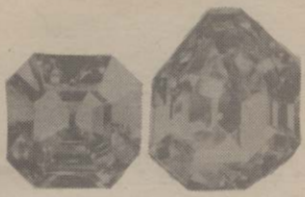

ہیروں کا ہیر پھیر

آج ہم آپ کو دنیا کے سب سے بڑے ہیرے کے متعلق ایک دلچسپ کہانی سنا رہے ہیں۔ یہ ہیرا دنیا میں پائے جانے والے تمام ہیروں میں سب سے بڑا ہے اور آج بھی لندن ٹاور میں موجود ہے۔

جنوبی افریقہ کا ایک علاقہ جوہانسبرگ ہیروں کی کانوں کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ جوہانسبرگ سے ۸۰ کلو میٹر اور (TRANSVA-AL نام کے ایک علاقے کے پاس (PREMI-ER نامی ایک کان ہے۔ جنوری ۱۹۰۵ میں اس کان کی کھدائی کے دوران ایک کان کن کو ایک دیوار پر ایک بڑی اور چمکدار شے نظر آئی۔ اس کان کن نے فوراً کان کے نگران کو بلا کر اسے وہ شے دکھائی۔ نگران نے وہ ٹکڑا اپنے جیبی چاقو کی مدد سے دیوار سے علیحدہ کر لیا۔

اس شئے سے مٹی وغیرہ صاف کرنے کے بعد نگراں یہ سمجھا کہ کسی نے اس سے مذاق کرنے کے لئے شیشے کا ٹکڑا وہاں رکھ دیا تھا۔ لیکن جلد ہی اس

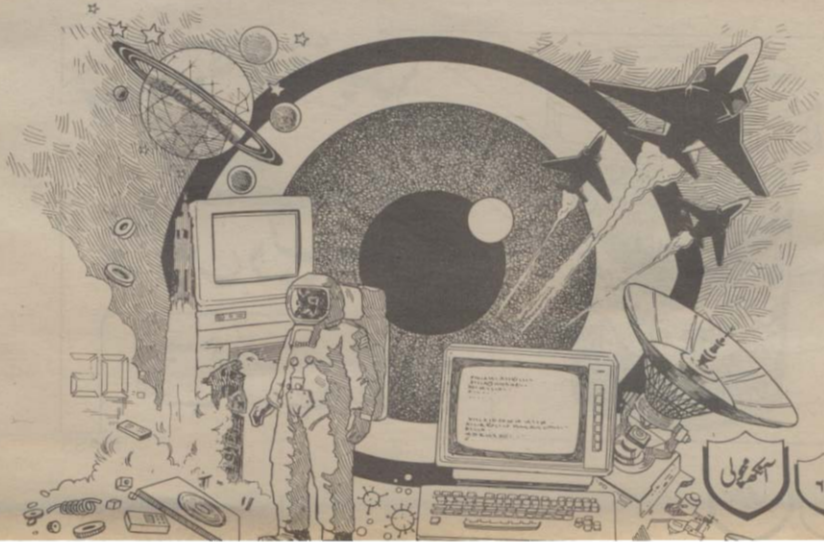

کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی کیونکہ وہ ٹکڑا ہیرا ثابت ہوگیا۔

ہیرے کا وزن ۶۸۰ گرام اور سائز یہ تھا۔ لمبائی ۱۶ انچ اونچائی ڈھائی انچ اور چوڑائی ۵ انچ

اس ہیرے کو کمپنی کے مالک (THOMAS CULLINAN) نے اپنے نام کی مناسبت سے (CULLINAN) نام دیا۔

تھومس صاحب نے اس ہیرے کو (TRA-NSVAAL GOVERNMENT) کے ہاتھوں ایک لاکھ پچاس ہزار پونڈ کے عوض فروخت کر دیا۔

۹ نومبر ۱۹۰۷ء کو حکومت ٹرانسوال نے یہ ہیرا برطانیہ کے بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کو تحفتاً پیش کیا۔

اسی سال بادشاہ نے ہالینڈ کے مایہ ناز جوہریوں (ASSCHER BROTHERS) کو لندن بلوایا تاکہ اس ہیرے کو تراشا جاسکے۔ ان جوہریوں نے ہیرے کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد بادشاہ سے کہا کہ ہیرے کے اندر کالا دھبا ہے اور اس کو صاف کرنے کے لئے ہیرے کو ہالینڈ لے جانا ہوگا۔ بادشاہ نے اس بات کی اجازت دے دی۔

ہالینڈ میں چھ مہینوں تک ہیرے کی ساخت، شکل، بناوٹ اور دیگر چیزوں کا معائنہ کیا گیا اور اس بات پر بحث کی گئی کہ ہیرے کو کس زاویئے سے توڑا جائے کیونکہ اگر ہیرا غلط طریقے سے توڑا جائے تو وہ بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور کسی کام کا نہیں رہتا۔

بالآخر ہیرے کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کام کے لئے ایک خصوصی میز بنوائی گئی جس میں ہیرے کو رکھنے کے لئے ایک پیالہ لگا ہوا تھا۔

بالآخر ۱۰ فروری ۱۹۰۸ء کو دوپہر کے وقت

تصویر — میں ہالینڈ کے ان مایہ ناز جوہریوں کو دکھایا گیا ہے جو چھ مہینوں کی محنت کے بعد اس ہیرے کو توڑنے میں کامیاب ہوئے

(JOSEPH ASSCHER) نے اس ہیرے کو پیالہ میں پھنسایا اور ہیرے سے بنے ہوئے بلیڈ کی مدد سے ہیرے پر چوٹ لگا کر ہیرے کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔

ہیرے کے تین ٹکڑوں میں سے دو ٹکڑوں کو مزید سات بڑے اور ۹۸ چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا۔ سب سے بڑے ٹکڑے کو صرف تراشا گیا تاکہ

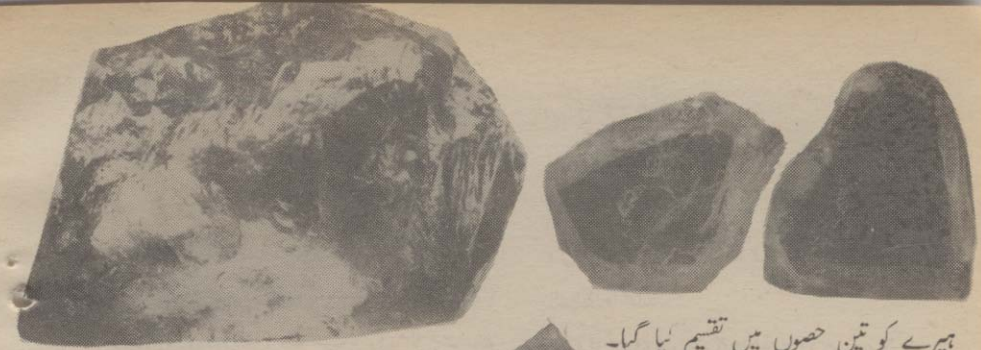

ہیرے کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

ہیرا اس شکل میں کان سے دستیاب ہوا

اس میں چمک پیدا ہو۔ اس کے بعد (HENRY) (KOE نامی آدمی نے اس کی پالش کی۔

تراشنے اور چمک دینے کے بعد ہیرے کا وزن ۵۳۰۶۲ قیراط ہے اور اس میں ۷۴ پہلو ہیں۔

ایک قیراط ۲۰۰ ملی گرام کا ہوتا ہے۔

اس ہیرے کا نام (CULLINAN-I) یا (STAR OF AFRICA) ہے۔ یہ ہیرا (SCEPTRE WITH CROSS) میں نصب ہے۔

ہیرا توڑنے کے بعد دوسرا بڑا ٹکڑا جو حاصل ہوا اسے (CULLINAN 2) یا (SECOND STAR OF AFRICA) کہا جاتا ہے۔ یہ بیضوی شکل کا ہیرا ہے۔ تراشنے اور چمکانے کے بعد اس کا وزن ۳۱۷.۴ قیراط ہے اور اس میں ۶۶ پہلو ہیں۔ یہ شاہی تاج میں نصب ہے۔ دیگر چھوٹے ہیروں کو تراشنے کے بعد شاہی خاندان کے افراد میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ تمام ہیرے لندن میں موجود ہیں۔

ہیرے کیوں چمکتے ہیں؟

ہیرے کی چمک کا تمام تر دارو مدار اس کے تراشنے پر ہوتا ہے۔ یعنی ہیرے کس طرح اور کس شکل میں تراشا گیا ہے۔

گول شکل میں جو ہیرا تراشا جاتا ہے اس میں چمک سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس طریقے کو (Brilliant Cut) کہا جاتا ہے۔

اس طریقے کو ۱۶۷۰ء میں ایک اطالوی جوہری (Vincenti Peruzziot) نے ایجاد کیا تھا۔ یہ طریقہ آج بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اس طریقہ کار کے تحت ہیرے کو اس طرح سے کاٹا جاتا ہے کہ اس کے اوپری حصے میں ۳۳ فیسٹ (FACET) ہوتے ہیں اس حصے کو

(CROWN) کہا جاتا ہے۔

کراؤن کے نچلے حصے کو (PAVILION) کہا جاتا ہے اس حصے میں (FACET 24) ہوتے ہیں۔

جب اس ہیرے میں روشنی داخل ہوتی ہے تو اس کے اندر قید ہو کر رہ جاتی ہے اور آمنے سامنے کی دیواروں سے مسلسل ٹکراتی رہتی ہے۔ روشنی باہر نکلنے کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے اور وہ ہے اوپر کی سطح یعنی کراؤن۔

روشنی ہیرے کے اندر داخل ہونے کے بعد سات رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور یہی رنگ ہیرے کی اوپری سطح سے جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کوہِ نور ہیرا:۔

کوہِ نور ہیرے کا وزن ۱۰۸٫۹۳ قیراط ہے۔

"کیا ہم ہیرے بنا سکتے ہیں"

مصنوعی ہیرے بنانے کا خواب انسان ایک عرصے سے دیکھ رہا ہے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس میں درپیش مشکلات کا اندازہ آپ اس بات کو جان کر ہی لگا سکتے ہیں کہ قدرتی ہیرے کس طرح اور کتنی مشکل سے وجود میں آتے ہیں۔

ہیرے بننے کا عمل بہت زیادہ طویل ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ بھی ہے۔ یہ عمل آج سے لاکھوں سال پہلے اس وقت شروع ہوا تھا جب ہماری نئی زمین جو بہت زیادہ گرم تھی۔ ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی اس وقت زمین کے اندر پتھر پگھلی ہوئی حالت میں موجود تھے۔

اس پگھلے ہوئے مادے کو اتنا زیادہ درجہ حرارت اور دباؤ ملا کہ اس مادے میں موجود کاربن کے کرسٹل بننا شروع ہو گئے۔ اور یہی شفاف اور انتہائی سخت کرسٹل ہیروں کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

ہیرے نہ صرف مشکل سے ملتے ہیں بلکہ انتہائی قیمتی بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کو مصنوعی طور پر بنانے کی متعدد کوششیں کی گئیں۔

لیکن اس سلسلے میں کامیابی ۱۹۵۴ء میں حاصل ہوئی۔ اس کام کے لئے ایک خصوصی پریس تیار کیا گیا جو انتہائی دباؤ ڈال سکے۔

اس مشین میں کاربن کو ۲۸۰۰۰ درجہ سینٹی گریڈ کا درجہ حرارت اور ۵۶۲۴۵ کلو پر اسکوائر سینٹی میٹر کا دباؤ فراہم کیا گیا۔ اس عمل کے نتیجے میں پیلے رنگ کا ہیرا میسر آیا جس کا سائز ۱۰۵ ملی میٹر تھا۔

چوں کہ مصنوعی ہیرے خوبصورت اور اعلیٰ معیار کے پس ہوتے ہیں اس لئے انہیں صنعتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

دو مصوّر
سلمیٰ سلیم

دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کی خواہش اکثر انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ توجہ حاصل کرنے کے لئے لوگ مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ان میں کچھ طریقے مثبت ہوتے ہیں اور کچھ منفی۔ مثلاً کچھ لوگ اداکار یا گلوکار بن جاتے ہیں۔ جب کہ کچھ لوگ مریض ڈاکو اور قاتل بن جاتے ہیں۔ کیوں جناب ڈاکو اور مسٹر مریض ہم نے ٹھیک کہا نا؟

تصویر گدوانے والا اینڈریو ڈیوسن اور چہرے پر نقش و نگار والا کارل گرین مثبت طریقوں سے توجہ حاصل کرنے والے افراد ہیں۔

اینڈریو ڈیوسن امریکہ کے فائر بریگیڈ کے محکمے میں کام کرتا ہے۔ اسے جسم گدوانے کا بڑا شوق ہے۔ اس شوق کا نتیجہ ہے کہ اس کے جسم پر طرح طرح کی تصاویر گدی ہوئی ہیں۔ ان تصاویر کی تعداد ۲۰ ہے۔ اس کے ہاتھ پر گدی ہوئی تصویر اس کے پسندیدہ اداکار جیک نکلسن کی ہے۔ جیک کا یہ خاص انداز اس کی ایک مشہور فلم کا سین ہے۔ اینڈریو کو یہ سین اس قدر پسند آیا کہ اس نے اس سین کو اپنے ہاتھ پر جیک کی تصویر گدوا کر محفوظ کر لیا۔

اس تصویر کے باعث اینڈریو کے ساتھ ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ اینڈیو بال کٹوانے کے لئے ایک، باربر کی دکان پر پہنچا۔ بال کٹوانے سے پہلے باربر کی نظر اینڈریو کے ہاتھ پر بنی جیک کی تصویر پر پڑ گئی۔ وہ باربر خود بھی جیک کا بڑا پرستار تھا۔ تصویر دیکھتے ہی باربر نہ صرف یہ کے شور مچا کر دکان پر موجود تمام گاہکوں کو اپنی اور اینڈریو کی جانب متوجہ کر لیا بلکہ اس نے اینڈریو سے درخواست کی کہ بال کاٹنے سے پہلے وہ اسے موقع دے کہ وہ اس کے ہاتھ پر بنی جیک کی تصویر کو پیار کر لے۔

ایک رسالے نے جسم پر تصاویر گدوانے کا ایک مقابلہ منعقد کیا۔ اینڈریو نے اس مقابے میں شرکت کی اور ۲۰۰ امریکی ڈالر یعنی تقریباً ۴۶۰۰ پاکستانی روپوں کا پہلا انعام جیتا۔

اینڈریو کے ہاتھ پر بنی یہ تصویر تقریباً پانچ گھنٹوں میں مکمل ہوئی تھی۔ اینڈریو کا کہنا ہے کہ نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ اپنے نچلے ہونٹ پر ایک تصویر گدوائے گا۔

رنگین صفحہ کے نیچے کی تصویر میں موجود کارل گرین کو اپنا چیرہ گدوانے میں تقریباً ایک سال لگا۔کارل کی اسس شکل کو جو بھی دیکھتا ہے ہنس دیتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ کارل بہت سے لوگوں کو ہنسا کر ان کا خون بڑھانے کا کام انجام دے رہا ہے۔ جو کہ ظاہر ہے بہت بڑی بات ہے کیونکہ اب لوگ دوسروں کا خون بڑھانے کے بجائے خشک کرنے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ جو ایک شیطانی کام ہے۔ ہم نے ٹھیک کہا نا؟

غور ہم پر کچھ ذرا فرمائیے

آپ کی ہم کو توجہ چاہیے

یہ تصویر دیکھ کر اچھا بھلا آدمی سوچنے لگتا ہے کہ اس تصویر میں چہرے پر نقش و نگار بنے ہیں یا نقش و نگار پر چہرہ بنا ہے؟ آپ بھی غور سے دیکھ کر سوچئے اور بتائیے۔

دیکھ کر ابو کا چہرہ مجھ کو آتی ہے ہنسی

بیچارے بچے

شاہنواز فاروقی

دوسرا اور آخری حصّہ

بے چارے بچے

جنگ کی تباہ کاریوں نے ہنستے بستے گھروں کو ملبے کا ڈھیر اور سسکیوں کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔ شہر کے شہر اُجڑ گئے تھے۔ اٹلی کے ایک تباہ شدہ شہر میں چند بچے کھنڈرات نما مکانوں میں بسیرا کرتے تھے۔ ان میں سب بچے ایسے تھے جن کے ماں باپ اور گھر بار جنگ کی نذر ہو چکے تھے۔ یہ دارالامان کی جیل نما پناہ گاہ میں جانے کے بجائے آزاد اور بہنا پسند کرتے تھے لیکن اپنی آزادی اور زندگی کو قائم رکھنے کے لیے انہیں کھانے پینے کا سامان چوری کرنا پڑتا تھا۔

مارکو اور جولی دونوں بہن بھائی ایسے ہی بچوں کے ایک گروہ میں شامل تھے۔ ایک دن ملبے میں سے اخبار تلاش کرتے ہوئے بہت سے روپے اُن کے ہاتھ لگے اور وہ اٹلی سے فرانس اپنی دادی کے پاس چلے گئے، لیکن فرانس پہنچ کر پتہ چلا کہ دادی کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ دادی کے مکان میں رہنے والی نیک صفت اور ہمدرد خاتون مادام ہینری نے اُن سے بہت اچھا سلوک کیا۔ مادام ہینری ایک غریب عورت تھیں۔ وہ زیادہ عرصہ ان بچوں کا بوجھ برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ اس لیے ایک دن انہوں نے مارکو اور جولی کو دارالامان بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

"آپ نے کہا تھا کہ آپ چار بجے تک آئیں گے" مادام نے قدرے پریشانی سے کہا۔

"جی ہاں" پولیس والے نے کہا۔ "میں معذرت چاہتا ہوں ہم نے آپ کے منصوبے میں دخل اندازی کی۔ اگر بچے گھر ہی میں ہیں تو بہتر ہو گا کہ یہ خاتون اسی وقت انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں تو ان کے کوائف معلوم کروں گا اور بس۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی" مادام ہینری نے اضطرابی کیفیت میں کہا "میں نے تو ان معصوموں کو ابھی تک یہ بات بتائی بھی نہیں۔ بہرحال اب آپ آ ہی گئے ہیں تو اندر آ جائیے اور ان کو لے جائیے۔"

تینوں نے اندر آکر دیکھا تو بچے وہاں نہیں تھے۔ انہوں نے مار کو، جولی کو، مادام ہینیرکی نے انہیں آوازیں دیں اور پھر انہوں نے پولیس والے اور دار الامان کی خاتون کی جانب مڑ کر دیکھا اور یوں ہاتھ پھیلائے جیسے کہہ رہی ہوں کہ پرندے تو اڑ گئے۔ بس چند لمحوں تک [illegible]

''انہوں نے یقیناً ہماری آوازیں سن لی ہیں اور چپکے سے نکل گئے۔''

پولیس والا یہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو دیکھا کہ دو بچے تیزی کے ساتھ سڑک کے کونے کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ پولیس والا وہاں پہنچتا، بچے اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

''تیز بھاگو... انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔'' مار کو نے ایک لمحے کو پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر جولی سے کہا۔

بچے فرانس کی گلیوں اور بازاروں میں سے گزرتے ہوئے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے پولیس والا، دار الامان کی خاتون اور مادام ہینیرکی تھیں۔ مادام ہینیرکی دو چار قدم چلنے کے بعد یہ ضرور کہتی تھیں ''بے چارے ننھے بچے، ننھے پیارے بچے''

بچے بھاگتے بھاگتے بندرگاہ پر آ پہنچے یہاں برطانوی فوجیوں کا ایک جہاز لندن کے لیے جانے کو تیار کھڑا تھا۔ مار کو اور جولی نے تاروں کی باڑھ عبور کی تو انہوں نے دیکھا کہ کچھ بڑے بڑے تھیلے رکھے ہوئے ہیں۔ دونوں بچے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ تھیلوں میں گھس گئے اور دم سادھ کر بیٹھ گئے۔

وہ چند لمحوں تک انتظار کرتے رہے کہ شاید کچھ ہو، مگر کچھ نہ ہوا۔ پھر انہوں نے محسوس کیا جیسے وہ آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ وہ کسی پانی کے جہاز پر سوار ہو چکے ہیں۔

مار کو خوش قسمت رہا۔ اس کا تھیلا ایک سپاہی نے اٹھایا اور ایک کیبن میں رکھ دیا۔ البتہ جولی کی قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ ایک سپاہی نے اس تھیلے کو دیکھا جس میں جولی چھپی ہوئی تھی اور بڑبڑایا۔

''یہ تو میرا تھیلا نہیں لگتا، اگرچہ اس پر میرا ہی نام لکھا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ تھیلے میں ڈالا تو اس کے ہاتھ نے ایک ایسی شے کو چھوا جو اس کی نہیں تھی۔ جولی خوف سے کانپنے لگی۔ اسے لگا چند انگلیاں اس کے بالوں کو کھینچ رہی ہیں۔ بہرحال وہ کیا کر سکتی تھی، وہ تھیلے سے نکل آئی۔

''خوب'' سپاہی نے اسے تھیلے سے نکال کر انگریزی میں کہا۔ جولی کو انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں

آتا تھا اس لئے اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا۔ اس نے فرانسیسی اور اطالوی زبان میں سپاہی کو بتانے کا سوچا، مگر پھر یہ خیال کر کے خاموش رہی کہ وہ ان دونوں زبانوں کو نہیں سمجھ سکے گا۔ چنانچہ اس نے اپنی سیاہ اور خوف بھری آنکھوں سے سپاہی کی طرف دیکھا۔

"معاف کرنا بچی"۔ سپاہی نے کہا۔ میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ تم میرے ساتھ رہو مگر کرنل اس کی اجازت نہیں دے گا۔" سپاہی نے بچی کی آنکھوں کا پیغام پڑھ لیا تھا۔

سپاہی نے جولی کو کاندھے سے پکڑا اور اسے لے کر تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور اسے جہاز سے اتار دیا۔

دوسری طرف مارکو شدید گرمی محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں جولی کہاں ہے؟ جہاز چیونٹی کی چال سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بالآخر مارکو سے برداشت نہ ہوا تو اس نے تھیلے سے سر نکال کر جولی کو ادھر ادھر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ مارکو نے تھیلے سے سر نکالا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک کیبن میں ہے۔ اس کے دل میں یکایک شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک گہری نظر سے آخری بار فرانس کی سر زمین کو دیکھے۔ چنانچہ وہ کیبن سے نکل آیا۔ کیبن سے باہر نکل کر اس نے جیسے ہی بندر گاہ کی طرف دیکھا تو مارے خوف کے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے دیکھا جولی گودی پر کھڑی ہے اور اس کے ساتھ پولیس والا، دارالامان کی خاتون اور مادام ہینری کھڑی ہیں۔ جولی اب فرار ہونے کی کوئی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ وہ رو بھی نہیں رہی تھی۔ وہ خاموش تھی اور حسرت سے جاتے ہوئے جہاز کو دیکھ رہی تھی۔

"میرے خدا!" مارکو کے منہ سے نکلا۔ لیکن اب تک جہاز گودی سے خاصی دور نکل آیا تھا۔ اب اس کے اور جولی کے درمیان موجیں مارتا ہوا سمندر حائل ہو چکا تھا۔ مارکو بلک بلک کر رو رہا تھا۔ وہ جہاز پر سوار انجانے مستقبل کی جانب بڑھ رہا تھا۔

مارکو ایک اسٹول پر بیٹھ کر بہت دیر تک روتا رہا۔ اب اسے اس بات کی رتی برابر بھی پروا نہیں تھی کہ کوئی اسے دیکھ لے گا تو اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے گا؟۔ وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ بہت پیاری چیزیں گم ہو جائیں تو پھر دو ہی باتیں ہوتی ہیں۔ یا تو انسان خوف کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر ہر خوف سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ مارکو کے ساتھ دوسری بات ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک افسر کیبن میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے کیبن میں اپنے تھیلے کو موجود پا کر سکون کا سانس لیا۔ تب ہی اس کی نظر مارکو پر پڑی، جو ابھی تک اسٹول پر بیٹھا روئے جا رہا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے بچے"؟ اس سپاہی نے نہایت نرم لہجے میں مارکو سے پوچھا۔ مارکو نے اس کی طرف

دیکھا اور پہلے سے بھی زیادہ زور زور سے رونے لگا۔ مشکل وقت میں کوئی نرم لہجے میں حال پوچھ لے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

"لگتا ہے یہ کوئی غیر ملکی ہے۔ چہرے سے تو فرانسیسی لگتا ہے۔" سپاہی نے سوچا اور پھر بچے سے فرانسیسی میں پوچھا۔

"کیا ہوا بچے؟"

"میری بہن" مارکو نے رندھی ہوئی آواز سے کہا "میری بہن گودی پر ہی رہ گئی۔ وہ اسے دارالامان میں بھرتی کروادیں گے ..... وہ تنہا ہے"

"اطالوی ہو؟" سپاہی نے بچے کے لہجے کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"اگر تم آہستہ بولو تو میں تمہاری بات سمجھ لوں گا۔ ذرا تم مجھے اپنی بات آہستہ آہستہ سے سناؤ۔"

سپاہی کی آواز سے نرم دلی صاف جھانک رہی تھی۔ البتہ اس کی اطالوی زبان کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ بہرحال مارکو نے اسے اٹلی میں اپنے گھر کی تباہی، والدین کی ہلاکت اور اپنے اور جولی کے کھنڈرات میں رہنے سے لے کر اب تک جو کچھ بھی پیش آیا تھا سب کچھ بتادیا۔ مارکو نے یہ بات خاصی زور دے کر بتائی کہ اس کی بہن فرانس میں رہ گئی ہے اور اب وہ لوگ اسے دارالامان میں ڈال دیں گے۔

سپاہی نہایت توجہ سے مارکو کی کہانی سنتا رہا۔ ہاں البتہ وہ بار بار "آہستہ آہستہ" کہتا رہا۔

"بے چارے معصوم بچے" پھر اس نے گہرا سانس لیا اور بڑبڑایا۔ مارکو نے اپنی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے سپاہی سے پوچھا۔ "اب میں کیا کروں؟"

"سنو" سپاہی نے اپنی پرخلوص آواز میں کہا۔ اب وہ اطالوی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔ "میں برطانیہ میں اپنے گھر جارہا ہوں۔ وہاں گھر پر میری بیوی میری منتظر ہے۔ تم میرے ساتھ چلو اور ہمارے ساتھ ہی رہو۔ بعد میں ہم تمہاری بہن کو تلاش کرلیں گے۔ ہم گھر پہنچ کر مادام ہینسری کو خط لکھ دیں گے وہ یقیناً ہمیں جولی کے بارے میں کچھ بتا سکیں گی۔ تم ذرا ایک منٹ ٹھہرو میں جہاز کے کمانڈر سے مل کر ابھی آیا اور ہاں گھبرانا نہیں، سب ٹھیک ہوجائے گا" لیکن وہ بہت دیر تک واپس نہ آیا تو مارکو کا دل گھبرانے لگا۔ لیکن تب ہی وہ سپاہی لوٹ آیا۔

"سب ٹھیک ہوگیا" وہ مارکو کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم مجھے فلپ کہہ سکتے ہو اور اب تم اپنی بہن کے بارے میں فکر کرنا چھوڑ دو اور اب تھوڑی سی انگریزی سیکھنے کی کوشش کرو۔ کہو..... گڈ

مارننگ"۔ سپاہی نے مارکو کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

مار کو نے بڑی کوشش کر کے نئے الفاظ منہ ہی منہ میں چبائے۔ اسکے نزدیک اطالوی بہت ہی نفیس زبان تھی اور فرانسیسی بھی ٹھیک تھی، مگر انگریزی تو اسے عجیب سی انوکھی سی لگی۔

"گڈ مارننگ فلپ۔" اس نے آہستہ سے کہا اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ کیونکہ انگریزی بولنا اسے بڑا ہی عجیب سا لگا تھا۔

اب مارکو فلپ اور اس کی بیوی لینجبلا کے ساتھ ایک خوبصورت سے مکان میں رہتا تھا۔ فلپ اور اس کی بیوی دونوں اس کے ساتھ محبت سے پیش آتے۔ وہ دونوں اس کا بڑا خیال رکھتے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ مارکو اب سکول جانے لگا تھا اور اس نے اسکول میں بہت سارے دوست بنا لئے تھے اور اب وہ ایک وقت کے لئے بھی بھوکا نہیں رہتا تھا اور نہ ہی کسی رات کو سردی سے ٹھٹھرتا تھا۔ دن مزے سے گزر رہے تھے۔ مارکو کو کبھی کبھی لگتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ مارکو اگرچہ بہت خوش تھا مگر جولی کو یاد کر کے وہ اکثر اداس ہو جاتا۔

وہ ہر آٹھویں دن جولی کو خط لکھتا تھا۔ برطانیہ میں آنے کے بعد فلپ نے جولی کو تلاش کروالیا تھا۔ وہ اسی دارالامان میں تھی جس میں مادام ہیمبری مارکو اور جولی کو بھرتی کروانے والی تھیں۔ جولی کے خطوں سے مارکو کو معلوم ہوا کہ وہ دارالامان اتنی بری جگہ نہیں جتنی ان کا خیال تھا۔ وہاں کے لوگ بھی بڑے مہربان تھے۔ جولی نے وہاں پر بہت سے دوست بنا لئے تھے۔ مادام ہیمبری ہر ہفتے اس سے ملنے آتی تھیں۔

"میں بہت خوش ہوں۔" جولی نے اسے پہلے خط میں لکھا تھا۔ "بس یہ ہے کہ یہاں مجھ سے اطالوی میں بات کرنے والا کوئی نہیں ہے اور تم میرے پاس نہیں ہو۔ تم مجھے بہت یاد آتے ہو۔"

ایک دن فلپ نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ جولی کو گرمی کی چھٹیوں میں یہاں بلا لیا جائے۔

"مگر پیارے ایک بات غور سے سنو۔" فلپ نے مارکو سے کہا۔ "ہمارا دل تو چاہتا ہے کہ تم دونوں یہیں رہو، مگر تم جانتے ہو کہ ہمارے مالی حالات اتنے اچھے نہیں ہیں کہ تم دونوں کو رکھ سکیں اس لئے جولی یہاں صرف گرمیوں کی چھٹیاں گزارے گی اور پھر اسے واپس جانا ہو گا۔"

"جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کی مہربانی ہے۔" مارکو نے فلپ سے کہا۔ مگر اس نے اپنے دل میں کہا اور ایک امید کے ساتھ کہا۔

"شاید یہ جولی کو دیکھیں تو...... تو شاید......"

بالآخر ایک دوپہر کو جولی آپہنچی۔ دونوں بہن بھائی لپٹ کر اتنا روئے اتنا روئے کہ فلپ اور

اس کی بیوی انہیں دیکھ کر رو دیئے۔ جولی اگرچہ بڑی خوش دکھائی دے رہی تھی مگر وہ تھی بالکل خاموش۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی احساس کی گرفت میں ہے۔ یا وہ پھر کچھ یاد کر رہی ہے۔ وہ مگر مگر کر ہر شے کا جائزہ لے رہی تھی۔ فلپ اور اس کی بیوی جولی کو غور سے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی ہے؟ ان دونوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ان دونوں کا سونا سونا گھر پوری طرح آباد ہو گیا ہے۔

جولی اچانک ٹہلتی ٹہلتی رک گئی اور گھوم کر اطالوی زبان میں مارکو سے بولی۔

"مارکو ہمارا اٹلی والا گھر اگرچہ اس گھر سے بہت مختلف تھا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے اپنا گھر اور یہ گھر ایک ہی لگ رہے ہیں۔"

وہ اتنی آہستہ بولی تھی کہ اگر فلپ کی بیوی اس کے قریب نہ ہوتی تو اسے پتہ نہ چلتا کہ جولی نے کیا کہا ہے۔ فلپ کی بیوی نے جولی کی بات سن کر فلپ کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

فلپ نے ہاں میں گردن ہلائی اور مارکو سے مخاطب ہوا "مارکو اگر جولی یہاں ہمارے پاس ہی رہنا چاہتی ہے تو رہ سکتی ہے۔"

"ہمیشہ کے لئے" مارکو نے بے تابی اور خوشی کے مارے بلند آواز میں پوچھا۔ "ہاں ہمیشہ کے لئے، ہم کسی نہ کسی طرح گھر چلا لیں گے۔"

یہ سن کر مارکو جولی کو کمرے کے ایک کونے میں لے گیا اور اس سے اطالوی میں لرزتی ہوئی آواز میں باتیں کرنے لگا۔ پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ فلپ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

"جولی یہاں رہنے کو تیار ہے" ..... مارکو نے یہ جملہ اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں دہرایا تاکہ کوئی غلط فہمی نہ رہے۔

جولی کی بات سن کر فلپ اور اس کی بیوی کے چہرے کھل اٹھے۔

"آئیں، عمدہ سی شام کی چائے ہو جائے۔" فلپ کی بیوی نے خوشی سے بھری آواز میں کہا۔

"ایک منٹ" جولی نے کہا اور مارکو کو ایک طرف لے جا کر دھیرے سے اس کے کان میں کچھ کہا۔

مارکو کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ بلکہ اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

"کیا بات ہے مارکو.....؟" فلپ نے پریشان ہوتے ہو پوچھا۔

مارکو نے سر جھکا دیا۔

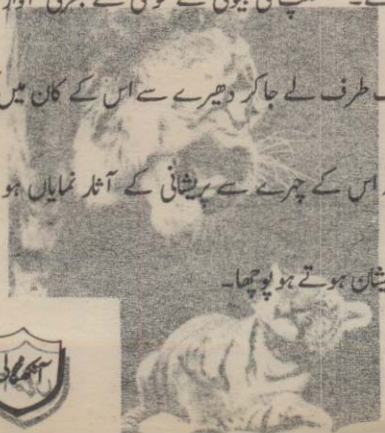

"کیا بات ہے جولی؟" فلپ کی بیوی نے جولی سے پوچھا۔
جولی نے مارکو کی طرف دیکھا اور بولی۔
"ہم یہاں ایک شرط پر رہیں گے۔"
فلپ اور اس کی بیوی کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ ساتھ حیرت کے تاثرات پھیل گئے۔
"کس شرط پر مارکو؟" فلپ اور اس کی بیوی نے ایک آواز ہو کر پوچھا۔
"اس..... اس شرط پر کہ آپ ہمیں کبھی بھی بے چارے بچے کہہ کر نہیں پکاریں گے۔" مارکو نے سر جھکا کر جواب دیا۔ وہ اپنے پیر کے انگوٹھے سے فرش کے پتلے اور پرانے قالین کو کھرچنے لگا تھا۔

یہ جواب سن کر فلپ اور اس کی بیوی نے گہرا سانس لیا اور اپنے تنے ہوئے جسموں کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ اگرچہ انہوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر ان کے چہرے کے تاثرات صاف صاف کہہ رہے تھے کہ ہم تمہیں بھول کر بھی بے چارے بچے نہیں کہیں گے۔

مارکو اور جولی نے ان کے چہروں سے ان کا جواب پڑھ لیا تھا۔ مارکو اور جولی کے چہرے فرطِ مسرت سے کھل اٹھے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب اس طرح دیکھا کہ جیسے وہ فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ اس خوشی پر روئیں یا ہنسیں؟ ایک دوسرے سے لپٹیں یا فلپ اور اس کی بیوی سے؟ فلپ اور اس کی بیوی نے شاید بچوں کی کیفیات کو سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ وہ خود ان کے پاس آئے اور پھر فلپ نے جولی کو اور فلپ کی بیوی نے مارکو کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور انہیں پیار کرنے لگے۔

تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کہ
انسانوں کے منہ نہ لگا کرو۔

سورج دادا کا پاجامہ

شاھنواز فاروقی

سورج دادا کا پاجامہ
لے تو آئے چندا ماما
پر جب پہنا، تب یہ جانا
چوک گیا ہے تیر نشانہ

ماما جی کا جسم نرالا
یعنی گھٹنے بڑھنے والا
کبھی ایک چوہے سا چھوٹا
اور کبھی ہاتھی سا موٹا

پہن کے ٹھنڈے نور کا زیور
ماما روز بدلتے تیور!
تھا جامے کا کپڑا کورا
بنا دیا ماما نے بورا!

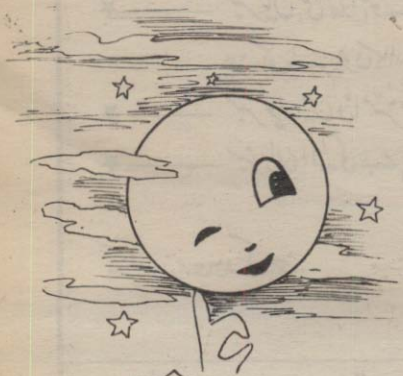

دیکھ کے دادی نے پاجامہ
مچا دیا گھر میں ہنگامہ
گھبرائے یوں چندا ماما
لکھنے بیٹھے معافی نامہ

پر اتنے میں سورج دادا
ہوئے مارنے پر آمادہ
چندا ماما چھوڑ پجامہ
بھاگے گاتے سارے گاما

(ماخوذ از ہندی)

منہ نہ بنائیے
سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے

گوشت، انڈے، دودھ دہی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر —— سبزیوں سے جی نہ چرائیے

★ —— سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں

★ —— سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے

★ —— سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں

یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔

★ —— سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں

★ —— سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے — سبزیاں شوق سے کھائیے — ہمیشہ صحت مند رہیئے

یہ اشتہار ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے بقائے صحت اور بہبودِ اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا

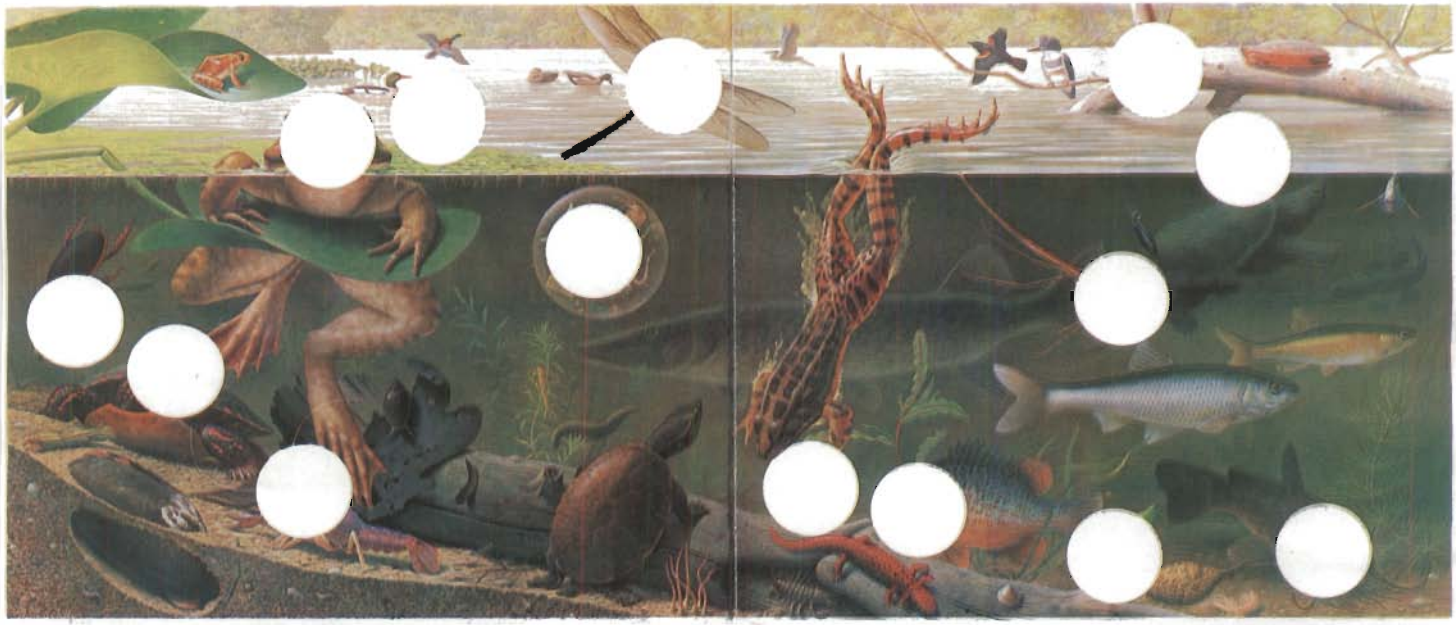

آنکھ مچولی

جھیل معمّا

مقابلۂ ذہانت ـــــ امتحانِ معلومات

یہ جھیل نظامِ فطرت کی جاندار مخلوق سے بھری ہوئی ہے ۔ اس میں زیرِ آب رہنے والی مخلوق بھی ہے اور سطحِ آب پر رہنے والے جاندار بھی آپ ان سب کو غور سے دیکھئے اور ① سب سے پہلے علیحدہ دیئے ہوئے دائروں کو کاٹ کر ٹھیک ان کی جگہوں پر چسپاں کیجئے ۔ ② پھر ان ۴۵ جانداروں کے نام کوپن میں پُر کر کے یکم نومبر ۱۹۹۰ء سے قبل ہمیں بھجوا دیجئے ③ دس قیمتی تحائف کی قرعہ اندازی میں ممکن ہے آپ کا نام بھی خوش قسمتوں میں شامل ہو ◉ کامیاب شرکاء کے نام جنوری ۱۹۹۱ء کے خاص نمبر میں شائع کیے جائیں گے ۔

یہاں سے کاٹیں

مقابلے میں شرکت کا کوپن

۱	۶	۱۱	۱۶	۲۱	۲۶	۳۱	۳۶	۴۱
۲	۷	۱۲	۱۷	۲۲	۲۷	۳۲	۳۷	۴۲
۳	۸	۱۳	۱۸	۲۳	۲۸	۳۳	۳۸	۴۳
۴	۹	۱۴	۱۹	۲۴	۲۹	۳۴	۳۹	۴۴
۵	۱۰	۱۵	۲۰	۲۵	۳۰	۳۵	۴۰	۴۵

نام .... عمر ....

کلاس ....

پتا ....

برگد کا درخت

مسعود ذکی

اصل نام تو بشیر تھا مگر پورے گاؤں میں وہ بابا بیرو کے نام سے مشہور تھا۔ عمر اس کی اسّی پچاسی سال سے تو کیا ہی کم ہوگی۔ جھکی ہوئی کمر، ہاتھ میں لاٹھی اور موٹے شیشوں کی عینک۔ مگر اس کی ہمت جوانوں جیسی تھی۔ کہتے ہیں بابا بیرو کے باپ نے اس کی پیدائش سے پہلے یہ منت مانی تھی کہ اگر ان کے ہاں لڑکا ہوا تو وہ سائیں سہدورے کا نام کا ایک درخت لگائیں گے۔ چنانچہ بابا بیرو کی پیدائش کے بعد انہوں نے اپنی منّت پوری کرنے کے لیے گاؤں کے بڑے ٹیلے کے پاس ایک برگد کا درخت لگا دیا تا کہ وہاں سے گزرنے والے مسافروں کو آرام مل سکے۔ بابا بیرو اور برگد کا وہ درخت ہم عمر تھے۔ ...... جانے اس منّت کا

اثر تھا کہ بابا بیرو کو پھولوں، پودوں، درختوں اور ننھی منی چڑیوں سے عشق تھا۔ پھول اس کی کمزوری تھے۔ ٹیلے کے اوپر اُس کا چھوٹا سا گھر تھا اور گھر کے اطراف ایک باغیچہ۔ میں جب بھی اس باغیچے میں جاتا مجھے لگتا جیسے میں کسی اور ہی دنیا میں آگیا ہوں۔ یہاں ہر طرف پھولوں کی بہار ہوتی اور بابا بیرو مجھے ہمیشہ اپنے باغیچے میں کام کرتا ملتا۔ کبھی تو وہ نئے پودے لگانے کے لئے زمین کھود رہا ہوتا اور کبھی درختوں کے سوکھے پتے توڑتا ہوا دکھائی دیتا وہ جب بھی مجھے ملتا بڑی محبت سے ملتا۔ مجھے بھی اس سے بہت اُنس تھا۔ وہاں آنے کے بعد میرا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں اکثر ٹیلے کے پاس سے گزرتے ہوئے برگد کے درخت کو دیکھتا تو مجھے بابا بیرو یاد آجاتا۔ میں سوچتا اس درخت میں اور بابا بیرو میں کتنی مشابہت ہے۔ برگد کے درخت کی تڑختی ہوئی کھال دیکھ کر مجھے بابا بیرو کا جھُریوں بھرا چہرہ یاد آجاتا اور برگد کی بوڑھی داڑھی مجھے بابا بیرو کی داڑھی لگتی۔ مگر میں اکثر سوچتا کہ بابا بیرو کا قد برگد کے درخت جتنا کیوں نہیں ہے؟ اس خیال پر مجھے خود بھی ہنسی آتی مگر اس خیال نے میرے ذہن کو مکڑی کی طرح ہر طرف سے جکڑ لیا۔ آخر ایک دن میں نے بابا بیرو سے یہ سوال کر ڈالا۔ بابا بیرو کام کرتے کرتے رک گیا۔ میری طرف غور سے دیکھا اور پھر ہنس کر بولا "دیکھو بیٹے کوئی چیز ہمیشہ باقی نہیں رہتی ہر چیز فنا ہو جائے گی مگر عمل اور خیال کی بلندی انسانوں کو پہاڑوں سے بھی اونچا کر دیتی ہے۔ نیکی اور عمدہ کردار کا اثر پتھر کی لکیر کی طرح ہمیشہ دلوں پر نقش رہتا ہے۔" بابا بیرو ہمیشہ ایسی باتیں کرتا اور ایسی باتیں ہمیشہ میرے سر سے گزر جاتیں۔

بابا بیرو کو پھولوں سے محبت تھی۔ ان پھولوں اور پودوں کو وہ اپنے بچوں کی طرح چاہتا تھا اور ان کا بیچنا اسے گوارا نہ تھا۔ ایک دن میں معمول کے مطابق بابا بیرو سے ملنے آیا تو خلاف توقع بابا بیرو کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ بابا بیرو کسی سے جھگڑ رہا تھا اور یہ میرے لئے حیرانی کی بات تھی۔ میں نے سنا وہ آدمی کہہ رہا تھا "جناب میں ان دو پودوں کے پچاس روپے دینے کو تیار ہوں اب تو مان جایئے۔" پھر مجھے بابا کی غصیلی آواز سنائی دی "میں نے کہہ دیا یہ پھول بیچنے کے لئے نہیں ہیں روپے پیسے سے آپ ان پھولوں کو خرید تو سکتے ہیں مگر ان کے حقیقی رنگ و بُو سے آپ لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ یہ حقیقی مسرت تو صرف ان پھولوں کی کاشت سے حاصل ہوتی ہے۔" وہ آدمی اس کے بعد خاموشی سے چلا گیا۔

دن گزرتے گئے بابا بیرو کی کمر اور جھکتی گئی مگر اس کے باغ کی دلکشی بڑھتی گئی۔ برگد کا وہ درخت اسی ٹیلے پر کھڑا رہا اور وہ سوال میرے ذہن میں گونجتا رہا۔ ایک دن گاؤں کے قریب بہنے والے دریا کو غصہ آگیا۔ کھیت، کھلیان، مکان، انسان سب اس سیلاب سے متاثر ہوئے مگر بابا بیرو کا مکان ٹیلے پر ہونے کی وجہ سے محفوظ رہا اور وہ برگد کا درخت سینہ تانے اسی طرح کھڑا رہا۔ انہی دنوں گاؤں میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ گاؤں والوں کے لئے پہلے ہی مصیبتیں کم نہ تھیں کہ اب رہی سہی کسر اس ہیضے نے پوری کر دی۔ ان

دنوں بابا بیرو بہت مضطرب اور پریشان لگتا تھا۔ لگتا تھا کوئی خیال اسے اندر ہی اندر ستائے جا رہا ہے۔ اس دن میں بابا کے پاس گیا تو بابا حسرت سے ایک ایک پھول کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو کچھ دیر چپ رہا پھر بولا "پُتر میں نے باغ بیچ دیا ہے" میں نے دیکھا تھا وہ آدمی جس کو اس دن بابا نے بہت زور سے ڈانٹا تھا، بابا کے پاس سے خوش خوش نکلا تھا۔ بابا کے ہاتھ میں اس وقت چند روپے تھے بابا کے اس فیصلے پر مجھے بہت حیرت ہوئی میں نے کہا "بابا یہ تم نے کیا کیا؟ اپنی سب سے قیمتی چیز کوڑیوں کے مول ناقدروں کے حوالے کر دی۔" بابا کچھ دیر چپ کھڑا رہا۔ عینک کے موٹے شیشوں کے پار اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے صاف نظر آ رہے تھے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "پُتر! انسان دوستی سب سے بالاتر ہے۔ پھولوں سے محبت نے مجھے انسانوں سے محبت کرنا سکھا دی ہے۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ گاؤں کے اوپر دکھ کے بادل منڈلاتے پھریں اور میں اپنے پھولوں پودوں میں مگن رہوں۔ میرے اس فیصلے سے اگر گاؤں والوں کے آنگن میں خوشی کے پھول کھل سکیں تو بیٹے یہ بہت بڑا کام ہو گا۔"

بابا نے اُسی دن میرے ساتھ جا کر وہ ساری رقم امدادی کیمپ میں جمع کرا دی جو گاؤں والوں کے لئے کھولا گیا تھا۔ اس دن مجھے ایسا لگا جیسے بابا کا قد ہم سب سے اونچا ہے۔ اونچا، اونچا، بہت اونچا برگد کے درخت سے بھی اونچا۔

گاؤں کی خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں۔ برگد کا وہ درخت آج بھی اسی ٹیلے پر قدم جمائے کھڑا ہے۔ گاؤں کے لوگ اور مسافر اس کے سائے میں آرام کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچے بوڑھے برگد کی لمبی داڑھی پکڑ کر جھولتے ہیں مگر اس دن کے بعد بابا بیرو گاؤں کے کسی شخص کو نظر نہیں آیا۔

نمک خوار

ایک بار اکبر اعظم اپنے درباری مسخروں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ حضور کو بینگن کا سالن کچھ لذیذ لگا فوراً بیربل سے فرمانے لگے "بینگن بڑی لذیذ سبزی ہے۔" "کیوں نہیں حضور، سبزیوں کا شہنشاہ جو ٹھہرا سر پر تاج رکھتا ہے۔" ابھی آخری الفاظ بیربل کے منہ ہی میں تھے کہ شہنشاہ والا شان کو نوالہ دائیں سے بائیں گھماتے ہوئے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ بادشاہ اور موت کا اعتبار ہی کیا؟ اس بار فرمایا: "لیکن کچھ بھی تو نہیں۔" "جی، درست فرمایا حضور نے، جیسی صورت ویسی سیرت۔" بعد میں کسی نے بیربل سے پوچھا کہ حضرت خیال بدلنے میں حضور کے نوالہ نگلنے تک تو توقف فرمایا ہوتا۔ اگر حضور اپنے خیال پر نظر ثانی کر....." "ہمیں بھی اپنے الفاظ واپس لینے میں دیر نہ لگتی کہ حضور کے نمک خوار ہیں بینگن کے نہیں۔" بیربل نے جواب دیا۔

1
2
3
جسے اللہ رکھے

آصف وقار آصف

بیمار رہنے کے فائدے

جی ہاں! یہ عنوان پڑھ کر آپ ضرور چونکے ہوں گے کہ بھلا بیمار رہنے سے کیا فائدے ہو سکتے ہیں؟ بیماری تو ایک مصیبت ہوتی ہے۔ "جی نہیں! آیئے ہم آپ کو ذرا تفصیل سے بتاتے ہیں کہ بیمار رہنے سے کیا کیا فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔

بھئی جب بھی کوئی بیمار ہوتا ہے تو ہمیں اس کی قسمت پر بڑا رشک آتا ہے۔ اگر وہ "صاحب مرض" گھر میں ہو تو سارا گھر اس کے آگے پیچھے پھرتا ہے۔ اس کے آرام و سکون کا مکمل خیال رکھتا ہے۔ اس کی مرضی اور پسند کی غذا فراہم کی جاتی ہے، جسے بیمار شخص بڑے مزے سے کھاتا ہے۔ اب تمام جاننے والے اس کا حال پوچھنے آتے ہیں اور اس سے بڑے لاڈ سے پوچھتے ہیں۔ "بھئی تمہارا کچھ کھانے کو دل چاہ رہا ہو تو بتاؤ۔ شرمانا نہیں" ایسے میں بے اختیار ہمارے دل سے یہ پکار اٹھتی ہے کہ "کاش! کوئی ہم سے

پوچھے کہ ہمارا دل کس چیز کو چاہ رہا ہے۔ "مگر گھر والوں کو بیمار کے ناز نخرے اٹھانے سے فرصت ملے تو ہم جیسے "ہٹے کٹوں" کی طرف دھیان دیں۔ جنہیں بیماری کبھی چھو کر بھی نہیں گزری ہے۔ ایسے میں ہمارا دل بے اختیار یہ چاہتا ہے کہ "بیمار کو گردن سے پکڑ کر باہر پھینکیں اور خود اس کی جگہ لیٹ کر ناز برداریاں اٹھوائیں۔

لیکن ہماری ایسی قسمت کہاں کہ ہم بیمار پڑیں اور اس طرح سے بیماری سے "لطف اندوز" ہوں۔ ہسپتال میں بیمار پڑنے والوں کے تو "وارے نیارے" ہی ہو جاتے ہیں۔ ہر کوئی پھولوں پھلوں سے لدا خیریت پوچھنے چلا آرہا ہے۔ مختلف قسم کے کھانے اور پھر سب کی بھرپور توجہ اور شفقت۔ ہمیں تو ایسا شخص بالکل "جنت" میں بیٹھا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے میں کس کم بخت کا دل کرے گا وہ ٹھیک ہو کر پھر سے کام دھندے میں جت جائے۔

چنانچہ انہی "آسائشوں" کو دیکھتے ہوئے ہم اکثر بیمار پڑنے کی "پریکٹس" کرتے رہتے ہیں۔ کبھی اسکول جاتے ہوئے پیٹ میں درد، کبھی پڑھتے ہوئے سر میں درد۔ یہ چھوٹے موٹے بہانے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ مگر امی ابو اب "سمجھدار" ہو گئے ہیں۔ وہ ہمیں کان سے پکڑ کر پڑھائی کرنے کے لئے بستر سے اٹھا دیتے ہیں۔ ایسے میں ہم بے اختیار بیمار پڑنے کی "دعا" کرتے ہیں۔

اس لئے ہمیں بڑی حسرت ہے کہ ہم ذرا "اچھی طرح بیمار پڑیں" کیونکہ بیمار پڑنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ہر طرح کا آرام اور کام سے چھٹی "اسپیشل کھانے" اور خصوصی دیکھ بھال الگ۔

مگر ہائے ری قسمت، لاکھ کوشش کرو، مگر ہماری بیماری "سر درد" سے آگے نہیں بڑھتی۔ بڑی کوشش سے بیمار بھی پڑیں تو بیماری "راس" نہیں آتی اور ہمارا بھانڈہ پھوٹ جاتا ہے۔ اب تو آپ بیمار پڑنے کے فائدے "اچھی طرح سے" سمجھ ہی چکے ہوں گے۔ کبھی آپ بھی بیمار پڑ کر دیکھئے (چاہے جھوٹ موٹ ہی سہی) کہ بیمار رہنے میں کتنے فائدے ہیں۔ بیمار پڑنے سے آپ اپنے آپ کو وی آئی پی (بہت اہم شخصیت) سمجھیں گے۔

چلئے۔ تو پھر آپ تیار ہیں ناں! بیمار پڑنے کے لئے!

نوٹ "بیمار پڑنے سے پہلے یہ مت بھولئے کہ ناز نخرے اٹھانے کے علاوہ کڑوی کسیلی گولیوں اور ڈاکٹر کے بے رحمانہ انجکشن سے بھی تواضع کی جاتی ہے۔

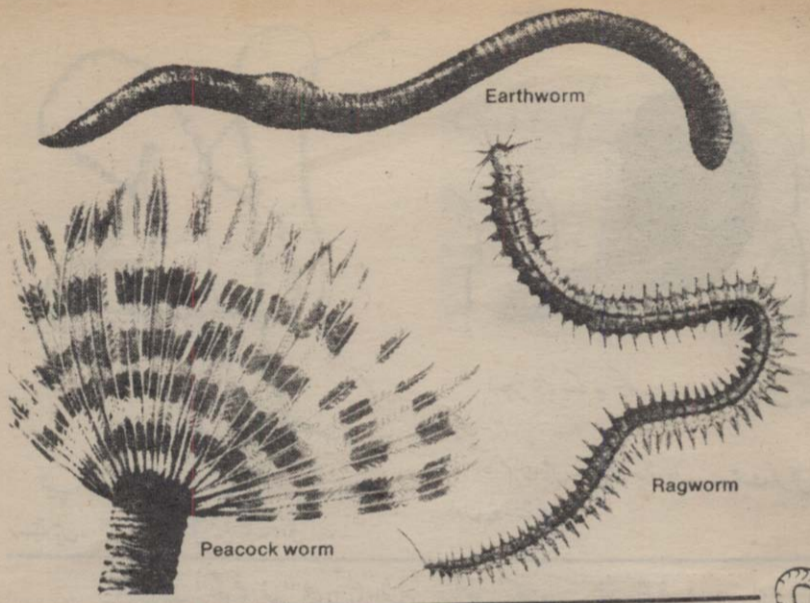

فطرت کی دُنیا

شین فاروقی

کیچوؤں کی کئی اقسام ہیں۔ کیچوے دنیا بھر میں ہر جگہ، ہر طرح کی زمین میں پائے جاتے ہیں۔ بہت سے جانور اپنی جوانی کے دور میں کیچوؤں کی طرح لگتے ہیں۔ کیچوؤں کی طرح لگنے والے ان جانداروں میں Caterpillars (تتلی کی ابتدائی شکل) خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو بعد میں تتلیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ البتہ اصل کیچوے دوسری شکل میں تبدیل نہیں ہوتے، کیچوے ٹیوب کی طرح کے جسم رکھتے ہیں۔ اور اپنے جسم کو آگے پیچھے حرکت دے کر آگے بڑھتے ہیں۔

کیچوؤں کی بعض اقسام خطرناک بھی ہوتی ہیں۔ بہت سے کیچوے حیوانات کے اندر رہتے ہیں۔ وہ انہی حیوانات سے غذا حاصل کرتے ہیں اور ان کو طرح طرح کی بیماریوں کا شکار بناتے ہیں۔ ٹیپ نام کے کیچوے حیوانات کی آنتوں میں رہتے ہیں۔ ان کے منہ اور پیٹ نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ اپنے میزبانوں کے پیٹ سے گزرنے والی غذا کو جذب کر کے زندہ رہتے ہیں۔ یہ حیوانات کے آنتوں کے اندر ہی انڈے دیتے ہیں۔ عام طور پر گندی غذا میں ان کیچوؤں کے انڈے موجود ہوتے ہیں جو کئی بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔ چنانچہ کھانے پینے کے سلسلہ میں صفائی کا خاص خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔

لیچز نام کے یہ کیچوے زیادہ تر پانی میں رہتے ہیں۔

تاہم ان میں سے کچھ جانوروں سے چمٹ کر ان کا خون چوستے ہیں۔

ٹیپ ورم نام کے یہ کیچوے حیوانات کی آنتوں میں رہتے ہیں۔ ان کی لمبائی ۹ میٹر تک ہوتی ہے۔

زمینی کیچوے "انگوٹھی نما" کیچوؤں کی اقسام سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں انگوٹھی نما اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کا جسم انگوٹھیوں کے ایک ایسے سیٹ کی طرح ہوتا ہے جو باہم جڑا ہوا ہو، ان میں سے ہر انگوٹھی کیچوے کے جسم کے ایک خاص حصہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ کچھ انگوٹھیوں کے اپنے دل ہوتے ہیں، جب کے کچھ انگوٹھیوں میں وہ حصے ہوتے ہیں جن کے ذریعہ نئے کیچوے پیدا ہوتے ہیں۔

کچھ کیچوے پھولوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ یہ سمندر کے بستر پر ریت میں چھپے پڑے رہتے ہیں۔ غذا حاصل کرنے کے لئے یہ کیچوے اپنے حساس بالوں کو ادھر ادھر حرکت میں لاتے ہیں اور اپنے آس پاس موجود ذرات کو قینچے میں لے کر غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ حساس بال سمندر کے بستر پر کسی جانور سے زیادہ پھول کی طرح لگتے ہیں۔ اگر کوئی دشمن ایسی حالت میں ان پر حملہ آور ہوتا ہے تو یہ کیچوا اپنے ان بالوں کو فوراً نیچے گرا لیتے ہیں۔ جس سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی بھلا ہوا پھول اچانک غائب ہو گیا ہو۔ ان میں سے کچھ کیچوے نالیوں میں رہتے ہیں۔ یہ نالیاں یہ کیچوے خود اپنی حفاظت کے لئے بناتے ہیں۔ کچھ کیچوے عام مٹی میں بھی دفن پڑے رہتے ہیں۔ اب کے بارش ہو تو اپنے آس پاس موجود کسی زمین پر بھربھری مٹی تلاش کیجئے گا۔

یہ بھربھری مٹی دراصل اس بات کی نشانی ہوتی ہے کہ یہاں کیچوا موجود ہے۔ بعض کیچوے بہت شرمیلے یا ڈرپوک ہوتے ہیں آپ انہیں ہاتھ لگائیں گے تو وہ مردہ بن کر لیٹ جائیں گے۔ لیکن اگر آپ انہیں ذرا سی دیر تک نہیں چھوئیں گے تو وہ فوراً اٹھ کر رینگنے لگیں گے۔ کیچوؤں کو چھونے اور ان کے مردہ بن کر پڑے دیکھنے کا عمل بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ ذرا اس عمل کو کر کے تو دیکھئے!

(اَدر ورلڈ آف نیچر سے ترجمہ)

مستقبل کے معمار

آج کل بچوں کے عالمی دن کے موقع پر بچوں کو بہلانے کے لئے خوب بڑھ چڑھ کر باتیں کی جارہی ہیں۔ میں اعلیٰ حکام سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا لمبی لمبی میزوں پر مذاکرے کرنے کے علاوہ کچھ کیا۔ کیا ہمارے ملک کے ان بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کیا جو پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں محض پڑھنے کی استعداد نہ رکھنے کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہیں۔ وہ معصوم لوگوں کے گھروں میں کام کرنے، نازک انگلیوں سے قالین بُننے جیسے سخت کام کرنے اور پھولوں جیسے ہاتھوں سے لوہے کے کام کرنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ کیا ہمارے اعلیٰ حکام نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ہمارے وطن کے کتنے بچے تعلیم کا شوق و جذبہ رکھتے ہوئے بھی تعلیم حاصل نہیں کر پا رہے ہیں اور اسکول یونیفارم میں ملبوس پیارے پیارے بچوں کو دیکھ کر احساس محرومی کے گڑھے میں دھنستے چلے جارہے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے ان بچوں کا بھی خیال کیا جن کے پاس نہ رہنے کو ٹھکانہ ہے اور نہ کھانے کو روٹی، جو کچرے کے ڈھیر سے رزق تلاش کرتے ہیں۔ یہاں تو بس اُن لوگوں کے ہی پیٹ بھرے جاتے ہیں جن کے پہلے ہی پیٹ بھرے ہوئے ہیں۔ ہزاروں روپے دعوتوں میں اُڑا دیئے جاتے ہیں۔ مگر ان بچوں کا خیال کوئی نہیں کرتا۔ کیا ہمارے قائد نے اسی لئے پاکستان بنایا تھا کہ یہاں کے معصوم بچے سڑکوں پر بھیک مانگیں۔ یہ ہمارے وطن کے بچے بھی مستقبل کے معمار ہیں۔ میں اعلیٰ حکام سے درخواست کرتی ہوں کہ ان بچوں پر بھی بھرپور توجہ دی جائے۔ بچوں کی کانفرنس میں نہ صرف ان بچوں کا تذکرہ بطور خاص کیا جائے بلکہ ان کی فلاح و بہبود کے لئے مثبت اقدام کے جائیں اور ان پر سختی سے عمل درآمد کا حکم دیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا یہ "کل" ضائع ہو جائے اور بڑے ہو کر یہ بچے انتقاماً کوئی غلط راہ اختیار کر بیٹھیں اور ملک و ملت کو نقصان پہنچائیں۔ خدارا ان معصوموں کو بھی ان کا حق دیجئے تاکہ یہ زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلنا سیکھ لیں اور اپنے وطن کو سنوارنے میں یہ سب کے ساتھ مل کر جدوجہد کریں اور اپنے وطن کو بھرپور استحکام بخشیں۔ (رضوانہ رؤف ..... لطیف آباد، حیدر آباد)

جھوٹی آس

محمد سلیم مغل

اقوام متحدہ کے زیر اہتمام بچوں کے لئے منعقد ہونے والی عالمی سربراہی کانفرنس کے موقع پر ایک اخباری مراسلے سے متاثر ہو کر۔

ارے کم بخت تو پھر لکھنے بیٹھ گیا!

ابا غصے سے چلائے۔

"کتنی بار سمجھایا ہے تجھے کہ چھوڑ دے کہانیاں لکھنا کچھ نہیں رکھا اس میں..... مگر تو ہے کہ تیری سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں۔"

ابا کو غصے میں دیکھ کر رشید نے فوراً اپنا قلم بند کیا میز پر بکھرے ہوئے کاغذ جلدی سے

سمیٹ کر بستر کے نیچے چھپائے اور ابا کے سامنے یوں آکر کھڑا ہو گیا جیسے اس نے ابا کی آواز سنی ہو مگر سمجھی نہ ہو۔ "جی ابا..... آپ کچھ کہہ رہے تھے کیا؟" رشید نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"تو کہانیاں لکھنے سے باز نہیں آئے گا کیا.....؟"

ابا نے رشید کو سامنے پا کر قدرے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "کیسی کہانی ابا؟ میں تو بشیر چاچا کو خط لکھا رہا تھا۔"

"اچھا اچھا..... پھر ٹھیک ہے مگر یاد رکھ کہانی وہانی مت لکھیو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ کیا سمجھے۔؟"

"نہیں ابا کہانی نہیں لکھوں گا۔ کبھی اعتبار بھی کر لیا کرو۔"

آج پھر رشید نے جھوٹ بول کر خطرے کو ٹال دیا تھا۔ مگر وہ اس بات پر خوش نہ تھا کہ اسے ہر روز محض اس لئے جھوٹ بولنا پڑتا تھا کہ وہ کہانی لکھتا ہے..... "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی" اس نے اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "آخر کب تک جھوٹ بولتا رہوں گا؟" اور پھر کہانی لکھنا اتنا بڑا جرم ہے کیا؟ ابا کیوں چڑتے ہیں کہانی لکھنے سے؟" ایسے بہت سے سوال اس کے ذہن میں آتے مگر ابا کے سامنے کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ وہ اکیلے میں خود ہی بڑبڑ کر چپ ہو جاتا یا کبھی کبھار اماں کے سامنے اپنا دکھڑا رو لیتا..... اتنی جرأت تو اماں میں بھی نہ تھی کہ وہ ابا سے اس مسئلے پر بات کرتیں اس لئے اماں بھی "اس کو سمجھا بجھا کر چپ کرا دیتیں۔ رشید کی عمر بھی کوئی زیادہ نہ تھی، یہی گیارہ بارہ برس ہو گی مگر اس کم عمری ہی میں اسے کہانیاں لکھنے کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ اب اسے اس کام کے علاوہ کسی اور کام میں مزہ ہی نہ آتا..... اپنے فارغ اوقات میں یا دوسرے کاموں کے دوران وہ اپنی کہانی کے تانے بانے بنتا رہتا اور جہاں کچھ وقت ملتا وہ فوراً لکھنے بیٹھ جاتا۔ وہ اب تک ایک سو سے زیادہ کہانیاں لکھ چکا تھا اور ان کہانیوں میں سے بھی زیادہ تر اخبارات میں بچوں کے صفحات پر شائع ہو چکی تھیں۔ چھوٹی سی عمر میں اتنی بہت سی کہانیوں کی اشاعت کوئی معمولی بات نہ تھی مگر اس غیر معمولی کارنامے کے باوجود اس کے دوست اور محلے کے دوسرے لڑکے یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ یہ کہانیاں اس نے لکھی ہیں شریر لڑکوں کی ایک ٹولی رشید کو دیکھتے ہی لہک لہک کر گانے لگتی۔

ہر طرف یہ شور ہے
رشید کہانی چور ہے

یہ نعرہ رشید کے ننھے سے دل کو بجھا کر رکھ دیتا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ کئی

بار اس نے دوستوں کو قسمیں کھا کر یقین دہانی کرانی چاہی کہ یہ کہانیاں اسے نے خود لکھی ہیں مگر لڑکوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

آخر ایک روز اس کی یہ الجھن ضیاء بھائی نے دور کر دی۔ ضیاء بھائی نے رشید کو سمجھاتے ہوئے کہا ...... "دیکھو رشید میاں تم اتنی اچھی کہانی لکھتے ہو کہ تمہاری عمر کا کوئی اور لڑکا عام طور پر ایسی کہانی نہیں لکھا سکتا۔ اس لئے لڑکوں کو یقین نہیں آتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ لڑکے چونکہ نکمے ہیں اور پڑھنے لکھنے سے جی چراتے ہی اس لئے وہ تم سے حسد کرتے ہیں اور تمہیں تنگ کرتے ہیں مگر تم ان کی پرواہ نہ کرو اور لکھتے رہو۔ ایک دن آئے گا جب سب لوگ تمہیں بہت بڑا ادیب تسلیم کر لیں گے۔ مگر یاد رکھو ہمت نہ ہارنا۔"

ضیاء بھائی کی باتیں اسے حوصلہ دیتیں اور وہ مطمئن ہو جاتا یوں بھی وہ ضیاء بھائی سے بہت متاثر تھا اس لئے کہ ضیاء بھائی بستی میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ بستی کے لوگ ضیاء بھائی کو کتاب کا کیڑا کہتے تھے۔ وہ واقعی کتابوں میں گھرے رہنے والے صاحب علم شخص تھے۔ رشید نے انہیں اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ وہ اپنی کہانی اخبار کو بھجوانے سے قبل انہیں دکھا کر اصلاح ضرور لے لیا کرتا۔ ضیاء بھائی رشید سے کوبیس پچیس برس بڑے تھے مگر رشید کے شوق اور علم سے اس کے لگاؤ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے اپنا دوست بنا لیا تھا اور وہ ہمیشہ رشید کو مخاطب بھی "میرے کم سن دوست" کہہ کر کیا کرتے۔

ضیاء بھائی کی دوستی رشید کو راس آئی اور وہ جنوں بھوتوں اور بادشاہوں کی کہانیوں کے بجائے قدرے مشکل موضوعات پر بھی لکھنے لگا۔

ضیاء بھائی سے منتقل ہونے والے مطالعے کے شوق نے رشید کی صلاحیتوں کو اور بھی نکھار دیا تھا اور اب اس کی کہانیوں میں جا بجا علمی حوالے بھی نظر آنے لگے تھے۔ رشید اب آہستہ آہستہ اچھا لکھنے والا بنتا جا رہا تھا مگر پچھلے کچھ عرصے سے ایک اور مشکل نے اسے گھیر لیا تھا۔

اس کی یہ مشکل خود اس کے ابا تھے جو اس کی پڑھائی چھڑوا کر اسے اپنے کسی موٹر مکینک دوست کے پاس کام سکھانے کے لئے بھجوانا چاہتے تھے۔

"ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا" رشید نے سوچا

"ایسا ہو کر رہے گا۔" یہ اس کے ابا کا حتمی فیصلہ تھا۔ ایک روز اسی موضوع پر گھر میں خوب چیخم دھاڑ ہوئی۔ رشید کے ابا کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"یاد رکھ مزدور کا بیٹا ادیب کبھی نہیں بن سکتا۔ اپنی اوقات کو نہ بھول۔ اس پاگل ضیاء نے تجھے بھی پاگل کر دیا ہے...... اگر میرا کہنا نہیں مان سکتا تو نکل جا گھر سے اور اگر گھر میں رہنا ہے تو کل سے استاد

کے پاس جانا شروع کر دے۔ " رشید کے ابا غصے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ گئے۔ وہ اپنا فیصلہ سنا چکے تھے اور رشید جانتا تھا کہ جو اس کے ابا کی زبان سے نکل جائے وہ پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے ابا اس کے دشمن نہیں بلکہ غربت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ مرتا کیا نا کرتا، اسے ابا کا کہنا ماننا پڑا۔

صبح سویرے جب نیلے پیلے یونیفارم پہنے ہوئے پھول سے بچے گاڑیوں میں، بگھیوں میں اور پیدل اسکول جارہے ہوتے، رشید اپنا میلا کچیلا اور تیل مٹی سے اٹا ہوا ڈانگری نما لباس پہن کر استاد کے ورکشاپ کی طرف چل دیتا۔ ورکشاپ کی طرف جاتے ہوئے اسے اپنا ایک ایک قدم ایک ایک من کا محسوس ہوتا۔ اسکول چھوٹ جانے کے دکھ نے اسے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ گو دن بھر وہ ورکشاپ کے بہت سے اپنی طرح کے بچوں کے ساتھ مل کر کام کرتا مگر کام میں اس کا دل ایک لمحے کو بھی نہ لگتا۔ دوپہر میں جس وقت اسکول کی چھٹی ہوتی اور بچوں کی ٹولیاں ہنستی مسکراتی باتیں کرتی اس کے سامنے سے گزرتیں تو اس کا چھوٹا سا دل بجھ کر رہ جاتا۔ اسے استاد کا ورکشاپ کسی ظالم خرکار کا بیگار کیمپ معلوم ہوتا اور اپنے آپ کو وہ پنجرے میں قید اس پرندے کی طرح سمجھنے لگتا جس کی رہائی کا کوئی امکان نہ ہو۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنے اکھڑ، ہٹیلے استاد کے سر پر ہتھوڑا دے مارے اور پھر دور کہیں بھاگ جائے جہاں سے کبھی واپس نہ آئے۔ وہ ایسا سوچتا ضرور مگر ایسا کر نہیں پاتا اس لئے کہ فطرتاً وہ سعادت مند، نیک اور سیدھا سادہ تھا۔ لڑنا جھگڑنا اور بدتمیزی کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ جن ہاتھوں سے اب تک اس نے صرف قلم پکڑنا سیکھا تھا اب اسے انہی ہاتھوں سے پلاس، پانے جمبور اور ہتھوڑیوں سے کام کرنا پڑتا تھا۔

ایک روز ضیاء بھائی نے رشید کی ڈھارس بندھائی "تم پریشان نہ ہو، میں نے تمہارے لئے وظیفے کا بندوبست کر لیا ہے۔ جس روز سے تمہیں وظیفہ ملنا شروع ہو گا تمہارے ابا کو بھی تمہارے پڑھنے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا بس چند روز کی بات ہے۔"

ضیاء بھائی کی باتوں سے امید کی ایک کرن روشن ہو گئی۔ وہ ایک ایک دن گن کر گزارنے لگا۔ کس دن وظیفہ ملے گا اور کس دن وظیفے کی خبر سنا کر وہ اپنے ابا کو اس بات پر آمادہ کر لے گا کہ وہ اسے پڑھنے کی اجازت دے دیں۔

چند روز بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی...... "رشید احمد کی کہانی "سچ کا صلہ" کو سال کی سب سے بہترین اور منتخب کہانی قرار دیا گیا ہے...... " خبر کے مطابق ایک ہفتے بعد شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں رشید احمد کو اس کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر انعام دیا جانا تھا...... یہ تقریب اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے کے توسط سے منعقد کی جارہی تھی۔

اخبار میں خبر کیا شائع ہوئی گویا بھونچال آ گیا...... رشید اور اس کے گھر والوں کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ ابا جو ہمیشہ رشید کے کہانی لکھنے پر نالاں نظر آتے تھے آج اپنے باصلاحیت بیٹے پر فخر کر رہے تھے۔ استاد کا رویہ بھی بدل گیا تھا اور ورکشاپ پر رشید کے بقیہ ساتھی بھی اسے رشک سے دیکھ رہے تھے۔ رشید کے گھر پر مبارک باد دینے کے لئے اس کے رشتے داروں کا تانتا بندھا ہوا تھا...... "ملک کی ایک بڑی شخصیت اپنے ہاتھوں سے رشید کو انعام دے گی۔" رشید کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ابا بھی بار بار یہی کہتے "کہیں یہ سب کچھ خواب تو نہیں ہے۔" "خواب نہیں ہے رشید کے ابا اللہ نے ہمارے دن پھیر دیئے ہیں...... دیکھا میں نہ کہتی تھی ہمارا بیٹا ایک دن ہماری قسمت بدل دے گا......" رشید کی اماں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی...... کچھ ایسی ہی کیفیت اس کی بہن زبیدہ اور بھائی فرید کی بھی تھی......

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ گیا جب رشید اور اس کے اہل خانہ روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد ہونے والی تقریب میں شریک ہوئے۔ اتنا بڑا اور اتنا خوبصورت ہوٹل اس سے پہلے انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی آنکھیں روشنیوں کی تاب نہیں لا رہی تھیں اور ان کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے...... تقریب کے آغاز میں بہت سی تقاریر ہوئیں۔ ایک دوسرے کے قصیدے پڑھے گئے، میزبانوں نے مہمانوں اور مہمانوں نے میزبانوں کے بچوں سے مخصوص تعلق اور محبت کے حوالے دیئے۔ بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کئے گئے کام اور لاکھوں روپے کے فنڈز کی بابت رپورٹس پیش ہوئیں۔ بہت سی تالیاں بجیں، خوب واہ واہ ہوئی۔ تقریب کے آخر میں جب شرکاء کی بڑی تعداد اکتا کر جمائیاں لینے لگ گئی تو رشید کو اسٹیج پر بلایا گیا...... تالیوں کے شور میں محترم مہمان خصوصی نے ایک لفافہ رشید کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اخبار کے فوٹو گرافر متحرک ہوئے۔ فلش چمکی، تالیاں بجیں شور ہوا اور رشید واپس آ گیا۔ وہ جونہی اپنے اماں ابا اور بہن بھائی کے پاس آیا تو سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے، ابا نے پیار کیا، ماں نے گلے لگایا۔ ابا نے احتیاطاً انعام کا لفافہ اپنے ہاتھ میں لے لیا کہ کہیں خطیر رقم کا لفافہ کھو نہ جائے۔

تقریب کے ختم ہونے سے لے کر گھر پہنچنے تک وہ لفافہ سب کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ لفافے میں سرٹیفکیٹ کے علاوہ ایک چیک ہونے کا یقین تو سب کو تھا مگر چیک پر کتنی رقم لکھی ہوگی؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بے چینی سب کے چہروں سے عیاں تھی، اس سے پہلے کہ لفافہ کھلتا، فرید نے ہنگامہ کر دیا "رشید بھائی مجھے سائیکل لے کر دو گے نا؟" "ہاں لے دوں گا...... پہلے لفافہ تو کھول لینے دو......"

لفافہ کھلا تو انگریزی میں تحریر کردہ ایک کاغذ کا پرزہ سب کے ارمانوں پر اوس ڈال گیا "دنیا بھر میں بچوں کے لئے کام کرنے والا یہ ادارہ رشید احمد کو بہترین کہانی لکھنے کے صلے میں اور اس کی صلاحیتوں کے

اعتراف کے طور سے یہ سند عطا کرتا ہے۔"
گھر کے سب لوگ حیرت کی تصویر بنے ایک دوسرے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ضیاء بھائی دروازے پر موجود تھے۔ انہوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ سرکار نے رشید کے لئے دوسو روپے سالانہ اسکالر شپ منظور کر لی ہے......
دو سو روپے! سال بھر کی تعلیم کا خرچ کل دو سو روپے۔ تقریباً ۱۷ روپے ماہانہ کا وظیفہ نہ تو یہ وظیفہ اس کے دن پھیر سکتا تھا اور نہ ہی کاغذ کا وہ پرزہ جو اسے ایک بہت بڑی تقریب میں دیا گیا تھا۔ اس کی ساری امیدیں ایک ایک کر کے دم توڑنے لگیں۔ وہ بہت دیر تک بت بنا خاموش کھڑا رہا۔
اگلے روز رشید صبح صبح اٹھا۔ اپنی میلی کچیلی ڈانگری پہنی اور بوجھل قدموں کے ساتھ استاد کے ورکشاپ کی طرف چل دیا۔

سوال

استاد (طلبہ سے) "جو کوئی ایسا سوال کرے گا جو پوری کلاس میں سے کسی کو نہ آئے تو اس کو میں دس روپے انعام دوں گا۔"
ایک طالب علم ہاتھ اٹھاتا ہے استاد اسے پوچھنے کا اشارہ کرتا ہے۔
طالب علم! "سر ایک چیونٹیوں کی قطار جارہی ہے آگے والی چیونٹی کہتی ہے کہ میرے پیچھے پانچ چیونٹیاں ہیں پیچھے والی چیونٹی کہتی ہے کہ میرے آگے پانچ چیونٹیاں ہیں جبکہ بیچ والی چیونٹی کہتی ہے کہ میرے آگے پیچھے دو دو چیونٹیاں ہیں آپ لوگ بتایئے کہ کل کتنی چیونٹیاں ہیں۔"
استاد کو اس کا جواب نہ آیا۔ لڑکوں سے بھی پوچھا مگر کسی کو جواب نہ آیا استاد نے دس روپے دیتے ہوئے طالب علم سے کہا، "اچھا تو اب تم بتاؤ؟"
طالب علم نے اطمینان سے دس روپے جیب میں رکھتے ہوئے کہا "جناب بیچ والی چیونٹی جھوٹ بولتی ہے۔"

عمر ریاض مغل۔ محراب پور

جاگو جگاؤ

مُصنّف : ثاقبہ رحیم الدین
تبصرہ : طاہر مسعود

خوبصورت کہانیوں کا حسین مجموعہ

کوئی زمانہ تھا جب گھروں میں ایک دادی اماں ہوا کرتی تھیں جو ہر رات سونے سے پہلے کہانی سناتی تھیں۔ "ہاں تو پیارے بچو۔ کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔" وہ زمانہ گزر گیا۔ وہ دادی اماں نہیں رہیں۔ اب جو کسی کسی گھر میں دادی اماں باقی رہ گئی ہیں وہ شام ہوتے ہی ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی ہیں۔ بچوں کو کہانیاں نہیں سناتیں۔ "باادب، باملاحظہ ہوشیار۔" دیکھتی ہیں۔ تو پھر بچوّں کو کہانیاں کون سنائے۔ کوئی بات نہیں۔ دادی اماں ٹی وی دیکھتی ہیں تو کیا ہوا، انہیں دیکھنے دیجئے۔ آپ کے لئے کہانیوں کی اچھی اچھی کتابیں تو ہیں۔ آپ پوچھئے گا مثلاً کون سی کتاب۔ میں کہوں گا: "جاگو جاگو۔" ممکن ہے آپ پھر سوال کریں: "جاگو جگاؤ" تو ہم نے سنا ہے یہ "جاگو جاگو" کیا ہے۔؟"
تب میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔

"جاگو جاگو" کہانیوں اور مضامین کی ایک بہت پیاری سی اچھی سی کتاب ہے۔ اس میں بڑی

خوبصورت کہانیاں ہیں اور مضامین تو بہت ہی مفید اور معلوماتی ہیں۔ شاید آپ کو یقین نہیں آیا۔ چلئے ہم آپ کو اس کی ایک کہانی سناتے ہیں: "پیارے بچو! بہت پرانے وقتوں کی بات ہے، جب نہ ہم تھے اور نہ تم۔ منوڑا نامی ایک چھوٹی سی بستی کراچی کے سمندر کے کنارے آباد تھی۔ ان دنوں وہاں رسول بخش نامی ایک خوش شکل اور نیک دل ملاح رہا کرتا تھا....."

مگر یہ تو لمبی کہانی ہے..... آپ ایسا کیجئے کہ یہ کتاب خرید کر کہانی اطمینان سے پڑھ لیجئے۔ صرف یہی کہانی نہیں ساری کہانیاں۔ جی کیا کہا آپ نے۔ مصنفہ! جی ہاں اس کی مصنفہ آپ کی جانی پہچانی ہیں ثقیہ رحیم الدین۔ آنکھ مچولی اور دوسرے رسالوں میں آپ نے ان کی تحریریں پڑھی ہوں گی۔ اچھا لکھتی ہیں نا۔؟ شاید آپ نہ جانتے ہوں کہ یہ سابق گورنر بلوچستان اور سابق گورنر سندھ جنرل رحیم الدین کی بیگم ہیں۔ بچوں سے انہیں بے پناہ پیار ہے۔ بہت مصروف رہتی ہیں لیکن بچوں کے لئے کہانیاں لکھنے کے لئے کسی نہ کسی طرح وقت نکال ہی لیتی ہیں۔ کبھی طیارے میں اڑتے ہوئے، کبھی ایئرپورٹ کے لاؤنج میں انتظار کرتے ہوئے۔ اچھا تو آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہماری ان سے دوستی ہے اس لئے ہم ان کی کہانیوں کی تعریف کر رہے ہیں۔ نہیں بھئی ہم تو ان سے کبھی ملے بھی نہیں۔ دیکھئے نا جب ہم نے ان کی کتاب دیکھی تو ہمیں یہ اس لئے اچھی لگی کہ یہ بڑے اچھے کاغذ پر چھپی ہوئی ہے اس میں ہر کہانی اور مضمون کے ساتھ رنگین تصویریں ہیں۔ بھولے بھالے بچوں کی۔ مصوروں کی بنائی ہوئی پینٹنگز ہیں۔ یہ بھی تقریباً رنگین ہیں۔ نیلے، پیلے، سبز، اودے رنگوں کی تصویریں ..... جو دیکھنے میں آنکھوں کو بھلی لگتی ہیں۔ اب ذرا کہانیوں کے عنوانات سن لیجئے۔ کیونکہ ہم ساری کہانیاں تو آپ کو سنا نہیں سکتے۔ ان دلچسپ کہانیوں میں "چڑیا کا گیت" "روشنی" "سرخ مچھلی" "ایک پیڑ کی کہانی" "سمندر اور موتی" "لال پری" "قصہ ایک سفید خرگوش کا" "اور اللہ جی تم سچ مچ پیارے ہو" وغیرہ شامل ہیں۔

اصل میں ثقیہ رحیم الدین صاحبہ سفر بہت کرتی ہیں۔ دنیا جہان کا سفر۔ وہ جہاں بھی جاتی ہیں انہیں کوئی نہ کوئی کہانی راستے میں مل جاتی ہے۔ آدمی جن سے پیار کرتا ہے ان سے اپنی ہر بات کہتا ہے۔ ثقیہ رحیم الدین صاحبہ کو چونکہ بچوں سے پیار ہے اس لئے انہیں جو بھی کہانی ملتی ہے اسے وہ بچوں کو سناتی ضرور ہیں۔ تو پھر کیا آپ ان کی کہانیاں پڑھنا پسند نہیں کریں گے۔ ایسا کیجئے کہ اپنے ابو یا امی سے کہئے کہ وہ یہ کتاب خریدیں۔ قیمت صرف تیس روپے ہے۔ اور ہاں کتاب کے ابتدائی مضامین دیکھ کر پریشان مت ہوئیے گا۔ اس میں بڑے بڑے ادیبوں نے مصنفہ کی تعریف کی ہے۔ اسے آپ چاہیں تو نہ پڑھیں۔ مصنفہ کی اصل تعریف تو وہی ہوگی جو آپ کہانی پڑھ کر کریں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا!

مقابلہ نمبر

غزل پزل

اسامہ بن سلیم

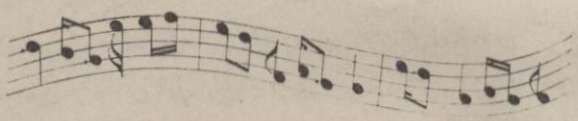

معلومات اور ذہانت کا منفرد ماہانہ مقابلہ

غزل پزل کا نیا مقابلہ آپ کی ذہانت کے امتحان کو چیلنج ہے۔ نئے چیلنج کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جائیے۔

اپنے نئے پڑھنے والوں کے لئے طریقہ کار کا بار بار بتانا ضروری ہو جاتا ہے۔ نئے ساتھی طریقہ کار بغور پڑھ لیں۔

دس تصاویر، اسکیچز یا علامتوں کو ۱۰ اشعار کی مدد سے شناخت کیجئے اور اپنے جواب شرکت کے کوپن پر لکھ کر ۱۵ نومبر سے قبل ہمیں بھجوا دیجئے۔ کوپن اسی شمارے کے آخری صفحات میں موجود ہے۔

تمام درست جوابات بھجوانے والوں میں سے تین کو بذریعہ قرعہ اندازی خوبصورت کتب یا انعامات بھی بھجوائے جائیں گے اور ان کے نام دسمبر کے شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔

لیجئے مقابلہ حاضر ہے۔

(مرتب)

قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی۔

۱۔ شاہد محمود بدر۔ ایف۔ بی ایریا کراچی ۲۔ نیر آفاق سبزواری۔ راولپنڈی
۳۔ طاہرہ اکرم اعوان۔ گلگشت کالونی ملتان

تمام درست جوابات بھجوانے والے ساتھیوں کے نام

۱۔ محمد باقر زیدی۔ کلفٹن کراچی ۷۔ عبدالرازق۔ ملتان
۲۔ عطیۃ العلیم ذکیہ۔ ایف۔ بی۔ ایریا کراچی ۸۔ سرفراز علی زنگیجو۔ ضلع بدین ماتلی
۳۔ عدنان احمد صدیقی۔ شاہ فیصل کالونی کراچی ۹۔ سائرہ افضل۔ ترین روڈ ملتان
۴۔ عبدالصبور اعوان۔ اسلام آباد ۱۰۔ محمد وقاص مقبول۔ ابدالی اسٹریٹ اچھرہ لاہور
۵۔ محمد سعید۔ شاداب کالونی ۱۱۔ توصیف دلشاد۔ ریورز گارڈن لاہور
۶۔ توفیق سجاول۔ اسلام آباد ۱۲۔ سید شان الحق۔ ڈبگری پشاور

گزشتہ ماہ کے درست جوابات

۱۔ بو علی سینا۔
۲۔ مونوگرام پاکستان ٹیلی ویژن۔
۳۔ کرکٹ میں امپائر کا اشارہ (لیگ بائی)۔
۴۔ اسکیمو اور اگلو
۵۔ نپولین بونا پارٹ۔
۶۔ ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف۔
۷۔ ریت گھڑی۔
۸۔ اسٹون ہینج (انگلینڈ)
۹۔ اسٹاپ واچ۔
۱۰۔ جوڈو۔

۱۔ علم و حکمت کا اک مکتب، یہ اس کا سردار
زہر پلانے والے حاکم اس سے تھے بیزار

۱

۲۔ ایک زباں ایسی ہے جس کو ہم تم سمجھ نہ پائیں
اس کو جو بھی پڑھ لے وہ ہے اچھا موسیقار

۲

۳۔ چاند ستارے کتنے دیکھے جگ مگ، جگ مگ کرتے
لیکن سب سے الگ تھلگ یہ کیسا ہے اسٹار؟

۳

۴۔ بچے اس کے یہ بچوں کی دنیا بھر میں ہر سو
بیماری اور جہل سے دیکھو برسرِ پیکار

۴

۵۔ دنیا بھر سے جنگیں کر کے فتح ونصرت پائی
اس کے آگے جو بھی آیا وہ نکلا لاچار

۵

۶۔ کتنے ڈھیر مسافر لے کر آنے جانے والا
نیل گگن کی وسعت میں ہے اڑنے کو تیار

۶

۷۔ ایک دھرم ایسا ہے جس کی بنی ہے یہ پہچان
ایک زمانے تک دنیا نے سمجھا تختہ دار

۷

۸۔ برساتوں میں باہر آئے پھر اندر چھپ جائے
حکماء اس سے کرتے ہیں کچھ نسخے بھی تیار

۸

۹۔ کہنے کو کشتی ہے لیکن نام جدا ہے اس کا
تیز ہواؤں کے دم سے ہے اس کی یہ رفتار

۹

۱۰۔ کرکٹ سے ملتے جلتے اس کھیل کو نو نو کھیلیں
امریکہ کے قومی کھیل کا نام نہیں شوار

۱۰

آنکھ مچولی مقابلہ مسکراہٹ

سنا ہے پھول برستے ہیں مسکرانے سے

مسکراہٹ ہمارے چہرے کا حسن بھی ہے اور ہماری باطنی خوشی کا اظہار بھی۔
بچے مسکرائیں تو دلوں کو سرور اور ذہنوں کو آسودگی ملتی ہے۔

کیا آپ کو دعویٰ ہے کہ

آپ، آپ کا بھائی بہن یا کوئی بھی عزیز بچہ مسکراتا ہوا بہت اچھا لگتا ہے۔

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ

آپ کی خوشگوار مسکراہٹ کی راہ میں گندے دانت، حائل نہیں ہیں

اگر ایسا ہے تو پھر مسکرائیے

مسکراتے ہوئے ایک خوبصورت رنگین تصویر ہمیں بھجوا دیجئے آپ کے موتی دانتوں کے ساتھ۔ آپ کی جگمگاتی مسکراہٹ پر ایک خوبصورت ہنستی مسکراتی شیلڈ SMILING SHEILD اور بہت سے تحائف آپ کے منتظر ہیں

شرکت کی آخری تاریخ ۳۰ نومبر ۹۰ء عمر کی حد تین سے ۱۳ سال ہے۔
غیر واضح تصویر مقابلے میں شامل نہ ہو سکے گی۔ تصویر کا پوسٹ کارڈ سائز ہونا ضروری ہے۔
تمام منتخب اور انعام یافتہ تصاویر جنوری ۱۹۹۱ء کے خاص نمبر میں شائع ہوں

مقابلۂ مسکراہٹ کے نتائج کے لیے جیوری درج ذیل اداروں کے نامزد کردہ نمائندوں پر مشتمل ہوگی

۱ کرسٹل ٹوتھ پیسٹ بنانے والے، انفورڈز پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۲ اسپارکل ٹوتھ پیسٹ بنانے والے، ٹرانسپاک (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۳ سگنل ٹوتھ پیسٹ بنانے والے، یونی برادرز پاکستان لمیٹڈ
۴ کالگیٹ ٹوتھ پیسٹ بنانے والے، کالگیٹ پامولو (پاکستان) لمیٹڈ

سگریٹ اور سنگاپور

سگریٹ نوشی تقریباً دنیا کے ہر حصے میں کی جاتی ہے اور اس سلسلے پر انتہائی کثیر رقم خرچ ہوتی ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں اس مُضرِ صحت عمل کے خلاف مہم انتہائی زور و شور سے جاری ہے۔ سگریٹ کے ڈبوں پر عام طور سے یہ لکھا نظر آتا ہے "خطرہ! سگریٹ نوشی سرطان کا سبب ہے" اس سلسلے میں سنگاپور کی حکومت نے زبانی جمع خرچ سے کام لینے کے بجائے عملی طور پر ایسے اقدامات کئے ہیں جو سگریٹ نوشی کے خاتمے کے لئے موثر ثابت ہو رہے ہیں۔

حال ہی میں سنگاپور کی حکومت نے ایک قانون نافذ کیا ہے۔ جس کے تحت بسوں، ٹیلیفون بوتھ اور دکانوں میں پوسٹرز لگانا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ سگریٹ بنانے والی تمام کمپنیوں نے بسوں پر

SINGAPORE

A LAW PROHIBITING the display of pictures of cigarettes or their brand names on vehicles, phone booths and counters has gone into effect as part of Singapore's campaign to become a nation of non-smokers. Tobacco companies have resprayed fleets of cars and trucks to remove logos, and shopkeepers have pulled down posters advertising an array of brands. The law also forbids the sales promotion and distribution of free cigarette samples and other tobacco products. Tough penalties exist for retailers and shopkeepers who break the new law. There is a maximum fine of $5000 or a prison term of up to six months, or both, for the first conviction. The punishment doubles for a subsequent conviction.

Since the Ministry of Health began its campaign to eradicate smoking among the population of 2.6 mill. the percentage of people who smoke fell to 13.5 percent in 1988 from 23 percent in 1977 – UPI

بنے ہوئے اشتہارات کو اسپرے پینٹ کر کے مٹا دیا ہے۔ اس کے علاوہ سگریٹ کی فروخت بڑھانے کے لئے مفت سگریٹوں کی پیشکش اور دیگر ترغیبات کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔

اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو ۵۰۰۰ امریکن ڈالر یا پھر ۶ مہینے کی سزا ہو سکتی ہے۔ یا بہ یک وقت دونوں سزائیں بھی دی جا سکتی ہیں۔ دوبارہ خلاف ورزی کرنے والے کو دگنی سزا دی جاتی ہے۔

ایئر کنڈیشنڈ ہوٹلوں، شاپنگ سینٹرز اور زیر زمین ریلوے میں سگریٹ پینے والے پر ۵۰۰۰ سنگاپوری ڈالر جرمانہ کیا جاتا ہے۔ سنگاپور میں یہ پوسٹر جگہ جگہ لگے نظر آتے ہیں۔

STOP SMOKING, LOOK GOOD, FEEL GOOD

"سگریٹ نوشی ترک کریں۔ اچھے نظر آئیں۔ اچھا محسوس کریں۔"

جب سے وزارت صحت نے ۲۶ لاکھ سنگاپوری لوگوں کی صحت کی بہتری کے لئے یہ اقدامات کئے ہیں۔ اس وقت سے اب تک سگریٹ نوشوں کی تعداد میں تیزی سے کمی واقع ہوئی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں ۲۷ فی صد لوگ سگریٹ پیتے تھے ۱۹۸۸ء میں یہ شرح کم ہو کر ۱۳٫۵ فی صد رہ گئی ہے۔

سنگاپور میں سگریٹ کے خلاف شروع کی جانے والی مہم میں لوگ بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ آپ بھی کوشش کریں کہ کسی ایسے کمرے میں جہاں سگریٹ نہ پینے والوں کی تعداد زیادہ ہو۔ وہاں کسی صاحب کو سگریٹ کا دھواں پھیلا کر کمرے کی صاف ہوا کو گندہ نہ کرنے دیں۔ کیوں کہ اصولاً سگریٹ پینے والے کو ہی سگریٹ سے خود کشی کرنی چاہئے، نہ کہ کمرے میں بیٹھے ہوئے بے گناہ لوگوں کو۔

اگر آپ کے والد بھائی یا کوئی عزیز سگریٹ پیتے ہوں تو انہیں سمجھائیں کہ سگریٹ چھوڑ دیں اور یہ بھی بتائیں کہ ان کی زندگی آپ سب کے لئے کس قدر ضروری ہے۔

شعبہ تحقیق و تلاش ماہنامہ آنکھ مچولی

سگریٹ نوشی کے مضر اثرات سے اہلِ خانہ کو محفوظ رکھنے کا آسان طریقہ

ذرا اینٹینا اونچا کرنا

انور کلیم بلوچ

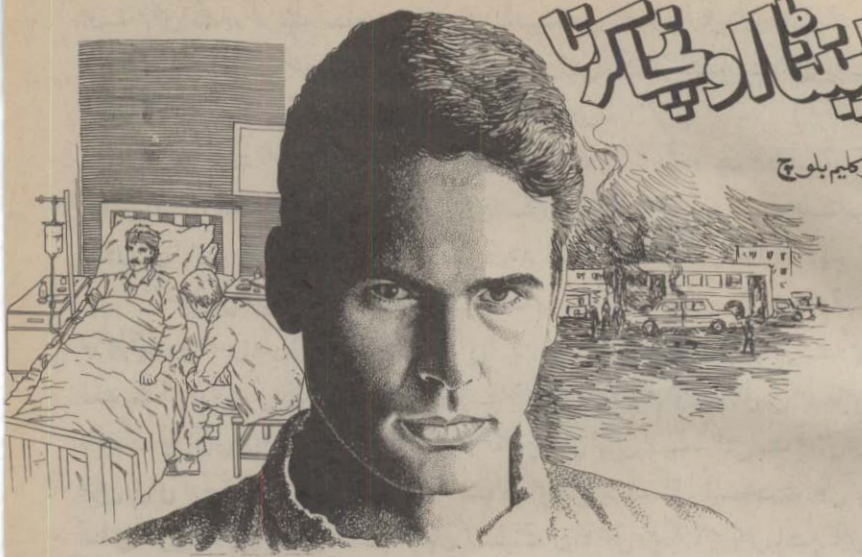

دوستو۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہم چھوٹے تھے اور ہماری عقل کے کچھ خانے خالی تھے (اگرچہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خالی خانے بھر تو گئے مگر..... گھاس سے) تب ایک دن ہمارے محلے میں شور ہوا کہ چوہدری خیر محمد کے گھر "ٹیلی ویجن" آیا ہے۔ لوگ بوڑھے بچے جوان سبھی بھاگے جا رہے تھے "ٹیلی ویجن" دیکھنے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ایسی کونسی چیز آگئی ہے کہ سب دیکھنے کے لئے بھاگے جا رہے ہیں؟ آخر ہم بھی تو بچے تھے بھاگم بھاگ چوہدری جی کے گھر پہنچے بڑی سی میز پر ایک لکڑی کا ڈبہ رکھا ہوا تھا جسے سب لوگ حیرت اور تجسّس سے دیکھ رہے تھے۔ چوہدری جی نے لکڑی کے ڈبے کا اگلہ حصہ ہٹایا تو وہاں شیشہ نظر آیا۔ "شام کو اس شیشے میں آدمی دکھائی دیں گے۔" چوہدری صاحب بڑے فخر سے بولے تھے۔ ہمیں یقین نہ آیا کیونکہ اس سے پہلے الیکشن کے وقت بھی چوہدری جی نے کہا تھا کہ یہ کام کریں گے وہ کام کریں گے مگر کیا کچھ نہ تھا۔ "ٹیلی ویجن" کی تھوڑی دیر نمائش کے بعد چوہدری جی نے سب کو نکال باہر کیا اور کہا کہ شام کو آنا۔ بڑی بے چینی سے سبھی شام کا انتظار کرنے لگے۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی اور سب دوبارہ چوہدری جی کے گھر جمع ہوئے۔ تب چوہدری صاحب نے ٹی وی آن کیا۔ ٹی وی شروع ہوتے ہی ہم سب کچھ بھول بھال کر شیشے میں آتے جاتے آدمیوں کو دیکھنے لگے۔ سب سے حیرت اس کی تھی کہ یہ چلتے پھرتے لوگ ہنس بول بھی رہے تھے۔ کتنا وقت گزر گیا ہمیں اندازہ بھی نہ ہو سکا۔ معلوم نہیں کس وقت چوہدری صاحب نے سب کو گھر جانے کا حکم دیا۔ بڑی حسرت سے ٹی وی کو دیکھتے

ہوئے ہم بھی اٹھے اور گھر چلے آئے دوسرے دن ہم نے اپنے ماموں سے جو کہ فرنیچر وغیرہ بناتے تھے کہا "ماموں جان..... کیا آپ لکڑی کے ڈبے پر شیشہ لگا کر ایسا ٹی وی نہیں بنا سکتے؟" مجھے یاد ہے ماموں یہ بات سن کر مسکرائے تھے (اور آج یہ بات سوچ کر میں خود مسکراتا ہوں۔)"

آہستہ آہستہ ہم "انکل عرفی"۔ "کلیاں"۔ "افشاں"۔ وغیرہ سے متعارف ہوتے گئے اس دوران بہت سے لوگ دوبئی سے رنگین ٹی وی لائے تو ہم بھی چوہدری جی کے گھر کے بجائے اب ہوٹلوں میں ڈرامے دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دن ہمارے ماموں نے دھماکہ خیز اعلان کر دیا۔

"ہم ٹی وی خرید رہے ہیں"۔ یہ اعلان ہمارے لئے عید کے چاند نکلنے کا اعلان سے زیادہ اہم تھا۔ اور پھر ایک دن ماموں جان ٹی وی کے ساتھ بوسٹر بھی خرید لائے ہم بار بار ان چیزوں کو بے یقینی سے دیکھ رہے تھے آخر خوشی خوشی انٹینا لگانے کا کام بھی ہم نے سرانجام دیا اور پھر ہم ہوتے اور ٹی وی..... خاصی رات گزر جاتی پی ٹی وی کی نشریات ختم ہوئیں تب ہم چینل پر چینل تبدیل کرتے۔ کہیں سے تھوڑی سی لہریں وی سی آر کی محسوس ہوتیں تو ہم کبھی انٹینا گھماتے اور کبھی چینل بدلنے لگتے۔ ایک بات بتانا بھول گیا کہ اس ساری کاروائی کی سربراہی ہمارے دادا جان کرتے تھے ان کا شوق دیکھ کر ہمیں اس بات پر یقین آجاتا تھا کہ جوں جوں انسان بوڑھا ہوتا جاتا ہے اس کے اندر ایک نیا بچہ جنم لینے لگتا ہے۔ کچھ عرصے تک تو ہم ٹیلی ویژن اور غیر ملکی نشریات کے چکر میں پھنسے رہے اور پھر بور ہو گئے۔

دوسرے لوگوں کی طرح ہم بھی چاہتے تھے کہ ہمارے ٹی وی پر بھی وی سی آر پر چلنے والی کوئی فلم یا غیر ملکی نشریات لپنا درشن دکھا دیں مگر ہم اتنے احمق بھی نہیں تھے کہ آڑی ترچھی لکیروں کو کہتے کہ واہ کیسی صاف تصویر ہے۔ ایک دن ہم نے سوچا کہ آج پشاور سینٹر کا پروگرام "تھروپراپر چینل" آرہا ہے لہٰذا کسی اچھے سے ہوٹل میں بیٹھ کر یہ ڈرامہ دیکھا جائے ورنہ دادا جان اور دوسرے لوگ ڈرامے کے دوران ہی غیر ملکی نشریات کے چکر میں ڈرامے کا مزا کرا کر دیں گے۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ دادا جان آگئے "بیٹا ذرا چھت پر چڑھ کر انٹینا کا رخ تو بدلنا" ان کے اس حکم پر چھت پر چڑھ گئے اور جوں ہی ذرا سا انٹینا گھمایا نیچے سے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم نے گھبرا کر چلا کر پوچھا کہ "کیا ہوا؟" پتہ چلا کہ تصویر کچھ کچھ صاف نظر آئی تھی اس لئے سب خوشی سے چیخ پڑے تھے اب ہم نے انٹینا کو مزید گھمایا جوں ہی ہم نے ذرا زور سے انٹینا گھمانا چاہا اپنے ہی جھونک میں آگے کی طرف لڑھک گئے دوسرے ہی لمحے ہماری دلدوز چیخ سب نے سنی اس کے بعد ہمیں کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو سر پر پٹیاں بندھی ہوئیں تھیں۔ اب جب بھی کسی کو چھت پر انٹینا گھماتے دیکھتے ہیں تو تصور میں وہ ہمیں اسپتال میں نظر آتا ہے! تب ہم سوچتے ہیں کہ کیا ٹیلی ویژن انٹینا کے بغیر ایجاد نہیں ہو سکتا تھا۔؟

معرکہ

ساجد سعید

سرخ شعلوں نے آس پاس کے مکانوں اور درختوں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ بارود کی بو سے ہمارے دماغ کچھ بوجھل سے ہوگئے تھے۔ دشمن پوری طاقت سے ہم کو پسپا کرنے کی کوشش میں تھا۔ ایسے میں، میں اور لیفٹننٹ اقبال ہاتھ میں دستی بم لئے دشمن کے مورچوں کی جانب بڑھنے لگے۔ جہاں دشمن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہمارے حملوں کو ناکام بنانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اقبال میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں نے اسکول میں ساتھ ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ہم دونوں نے فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے پر میرے اور اقبال کے گھر والوں نے مخالفت کی۔ آخر کار ہم اس نیک ارادے میں کامیاب ہوئے اور دونوں فوج میں بھرتی ہوگئے۔ اس وقت ملک کے حالات کچھ زیادہ ساز گار نہ تھے۔ پڑوسی ملک کے ارادے نیک نہ تھے۔ جسے دیکھتے ہوئے ہمیں سرحد سے ایک ہزار فٹ کے فاصلے پر تعینات کر دیا گیا تاکہ ہم دشمن کی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکیں اور ضرورت پڑنے پر بروقت

جواب دے سکیں۔ مقبوضہ کشمیر میں حریت پسندوں کی تحریک عروج پر تھی۔ جب ظلم کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں تو بھارت نے اپنی کمزوری چھپانے کے لئے پاکستان پر الزام دھرنا شروع کر دیئے۔ اس وقت میں اور میرا دوست اقبال سیکنڈ لیفٹننٹ کے عہدے پر فائز تھے اور ہم دونوں نے اتفاق سے فوج کی تربیت ساتھ ہی حاصل کی تھی۔ لیفٹننٹ اقبال ایک محبِ وطن فوجی تھا۔ اس کے خیال میں اگر انسان کو مرنا ہے تو ملک کے لئے لڑتے ہوئے کیوں نہ مرے۔

جناب کرنل عبدالرحمٰن نے جو ہماری کچھ کمپنیوں کے چیف تھے، ہمیں چوکس رہنے کی ہدایت کی۔ یہ اکیس اگست کی سرد رات تھی۔ ہمارے فوجی جوانوں نے وہ سرد رات اللہ کی یاد میں گذاری۔ اگلی صبح پاک فوج کے جوانوں کے حوصلے بلند تھے۔ ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ وہ اس معرکے میں آگے ہی آگے رہے۔ لیفٹننٹ اقبال کے چہرے پر یہ جذبہ سب سے نمایاں تھا۔ لیکن کوئی بھی فوجی اس سعادت سے محروم رہنا نہیں چاہتا تھا۔ کرنل عبدالرحمٰن کی ہدایت کے مطابق جنگ بندی لائن کے کناروں کو ہم نے جلد از جلد ہموار کیا تاکہ ہماری بٹالین کو وہاں سے گزرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اس کے بعد ہمارے کچھ ٹینکوں اور کچھ فوجی جوانوں نے آٹھ کمپنیوں کے ساتھ پیش قدمی شروع کر دی جس میں، میں اور میرا دوست اقبال بھی شامل تھے۔ ہمارے سامنے بھارت کی بہت سی چوکیاں تھیں جس میں بہت سی مشین گنیں اور ٹینک شکن توپیں نصب تھیں۔ ہمارے پاک سرزمین کے فوجی جوان بھی صورِ تحال سے نمٹنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ ابھی ہم کچھ ہی آگے بڑھ پائے تھے کہ دشمن کے توپخانے نے گھن گرج کے ساتھ گولہ باری شروع کر دی۔ ادھر ہمارے نوجوان جو پہلے ہی تیار تھے انہوں نے اپنے توپخانوں اور مشین گنوں کا منہ کھول دیا۔ اب دونوں اطراف سے جنگ کی ابتداء ہو چکی تھی۔ ہماری چار کمپنیوں اور بٹالین نے جنگ بندی لائن عبور کر لی۔ اب صورتحال یہ تھی کہ ہم دشمن کی دو چوکیوں جس میں پودے جال اور جھنڈ کے درمیان سے گذر رہے تھے اسی دوران دونوں اطراف سے دشمن نے ہمیں گھیرنے کی کوشش کی۔ ابھی ہم حفاظتی تدابیر اختیار کر ہی رہے تھے کہ دشمن کی جانب سے گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ میری پوزیشن بند کے پیچھے تھی جو تقریباً دو فٹ اونچا تھا جبکہ لیفٹننٹ اقبال کی پوزیشن مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیلے کے پیچھے تھی۔ کرنل عبدالرحمٰن کی ہدایت کے مطابق ہمیں دشمن کے اہم مورچوں کا نشانہ لینا تھا۔ ہمارے چاروں طرف افراتفری کا عالم تھا۔ لیفٹیننٹ اقبال اپنی پوزیشن سنبھالے موقع کی تاک میں تھا۔ ادھر دشمن نے ہمارے ٹینکوں پر چاروں اطراف سے فائر کھول دیئے تھے۔ کرنل عبدالرحمٰن کی ہدایت پر ہمارے ٹینک سمتیں بدل بدل کر فائر کرنے لگے۔ اسی اثناء میں کچھ گولیاں اقبال کے سر کے اوپر سے گذر گئیں۔ اسی لمحے اقبال نے اپنی مشین گن کا منہ کھول دیا اور دشمن کے بہت سے فوجی وہیں ڈھیر ہو گئے۔

جنگ کے میدان پر کچھ سکوت طاری ہو گیا۔ کرنل عبدالرحمٰن نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہمیں اپنی اپنی پوزیشنیں بدلنے کو کہا لیفٹننٹ اقبال اسی دوران کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا میں نے آگے بڑھ کر وجہ دریافت کی۔ "نہیں یار! اپنی تو کوئی بات نہیں، یار میری زندگی کی ایک خواہش ہے کہ کسی طرح بھارتی درندوں کے ظلم و ستم سے کشمیریوں کو آزادی مل جائے تاکہ یہ لوگ آزادانہ طریقے سے اپنی زندگی گزار سکیں۔ یار سمیع! جب ظلم کی زنجیریں جوش ایمان سے لرزنے لگتی ہیں تو غلامی اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔" میں نے اقبال کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ "تم صحیح کہتے ہو۔ آزادی تو کشمیریوں کا بنیادی حق ہے ..... وہاں کی تہذیب ہندو تہذیب سے مختلف ہے۔ آخر وہ کس طرح اس غلامی میں زندگی بسر کر سکتے ہیں۔" ابھی ہم دونوں انہی باتوں میں الجھے ہوئے تھے کہ کرنل عبدالرحمٰن نے ہمیں اپنی پوزیشنیں سنبھالنے کو کہا کیونکہ ہمارا اگلا ٹارگٹ نگیال گاؤں تھا جو سیگری اور پک پنڈٹ کے قریب واقع تھا۔ کرنل عبدالرحمٰن نے توپ خانوں کو حکم دیا کہ وہ نگیال پر گولہ باری شروع کر دے۔ ہمارا توپخانہ بڑا مستعد تھا۔ اس نے دشمن کو تتر بتر کر کے رکھ دیا۔ ہم نے دشمن کے دو پلاٹون کو محاصرے میں لے لیا۔ انہوں نے ہمارے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان میں پچاس کے لگ بھگ فوجی تھے جس میں زیادہ تعداد ہندو اور سکھوں کی تھی جو بدحواسی کا شکار تھے۔ غصے سے ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ لیکن ہم ان سے بڑے حسن سلوک سے پیش آئے۔ کیونکہ اسلام نے ہمیں اخلاقیات کی تعلیم دی ہے۔ اسی دوران کرنل عبدالرحمٰن کو اچانک وائرلیس سیٹ پہ بریگیڈیئر ہیڈ کوارٹر سے کچھ ہدایات وصول ہوئیں جس کے مطابق ہم کو سب سے پہلے نگیال کو محاصرے میں لینا تھا۔

ہمارے چاروں طرف خوفناک دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا دشمن کا ایک گولہ ہمارے ایک ٹینک پہ آ کر گرا اور اس ٹینک کا ایک فوجی جوان باہر کی جانب کودا اور وہ سیدھا دشمن کی بٹالین کی طرف بھاگا اور اپنی مشین گن سے دشمن کے بہت سے فوجی ڈھیر کر دیئے۔ لیکن اسی وقت بائیں جانب ایک فضا کو چیرتی ہوئی گولی اس کے دماغ میں پیوست ہو گئی اور اس جوان نے جام شہادت نوش کیا۔ وہ پہلا شہید تھا ہماری کمپنی کا۔ اس منظر کو دیکھ کر اقبال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اپنے ساتھی کی شہادت کی خوشی میں ان کے چہرے پر ایسا جذبہ نمایاں تھا جو ایک مردِ مجاہد کے چہرے پر ہوا کرتا ہے۔

آج جنگ کو دسواں روز تھا۔ ہمارے بہت سے ساتھی شہادت کی منزل پر قدم رکھ چکے تھے۔ فضا میں ہر طرف جنگی طیاروں اور زمین پر توپ شکن توپوں نے آس پاس کے ماحول کو بڑا بھیانک بنا دیا تھا۔ ہر طرف آگ کے سرخ شعلے تھے۔ لیفٹننٹ اقبال جو ہماری کمپنی میں شامل تھا بڑے جوش و جذبے کے ساتھ دشمن سے نبرد آزما تھا۔ بارود کی بدبو سے ہمارے دماغ کچھ مضطرب ہو گئے تھے۔ چہروں پر کالک نے

ہمارے اصلی روپ کو چھپالیا تھا۔ اچانک کرنل عبدالرحمٰن ہماری جانب آئے اور ہدایت دی کہ میں لیفٹننٹ اقبال اور کچھ ساتھی دشمن کو اپنی طرف متوجہ رکھنے کی کوشش کریں اور ہم دائیں جانب سے سامنے والا نالہ عبور کر کے پیچھے سے دشمن کو محاصرے میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ لوگ اس وقت تک دشمن کو کنٹرول میں رکھئے گا جب تک پیچھے سے حملہ نہ ہو۔" یہ ہدایات دے کے کرنل عبدالرحمٰن کچھ بٹالین اور چار کمپنیوں سمیت دائیں طرف والا نالہ عبور کرنے کے لئے روانہ ہوگئے اور ہم سب نے رک کر اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں دشمن متواتر ہم پر گولہ بارود استعمال کر رہا تھا جس کے شور میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

کرنل عبدالرحمٰن کو اپنے کمپنیوں کے ساتھ گئے ہوئے کوئی پون گھنٹہ ہونے کو آیا تھا کہ اچانک سامنے والے نالے کے پچھلی جانب سرخ گولے نظر آئے۔ یہ ہمیں اس بات کا اشارہ تھا کہ کرنل صاحب وہاں پہنچ چکے تھے۔ اشارہ ملتے ہی لیفٹننٹ اقبال نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے مورچے سنبھال لیں اور دشمن پر حملہ کر دیں۔ کوئی رات آٹھ بجے کا وقت تھا۔ توپوں اور ٹینکوں کے شعلوں سے ماحول میں ایک عجیب سی دہشت پھیل گئی تھی۔

لیفٹننٹ اقبال بڑی مستعدی سے دشمن پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ اس کی طرف ہر آنے والی گولی اس کے جذبے کو حرارت بخش رہی تھی۔ کرنل عبدالرحمٰن کی بٹالین نے گاؤں کے آس پاس کے علاقے کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ وہاں پر صرف ایک مورچہ ایسا تھا جہاں دشمن نے اپنے بہت سے فوجی بٹھا رکھے تھے جو اسلحے سے پوری طرح لیس تھے۔ اچانک لیفٹننٹ اقبال ہاتھ میں کچھ بارود لئے دشمن کی صفوں کو تتر بتر کرتے ہوئے اس مورچے کی جانب بڑھنے لگا جہاں دشمن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تاک لگائے بیٹھا تھا۔ پھر اچانک فضا ایک دھماکے سے لرز اٹھی اور وہ آخری مورچہ پر خچوں کے ساتھ فضا میں اڑ گیا۔ جی ہاں یہ لیفٹننٹ اقبال ہی کا کارنامہ تھا جس نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر ملک کے خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ نہیں معلوم یہ خوشی کے آنسو تھے یا غم کے۔

ایک وزیر پاگل خانہ کا دورہ کر رہا تھا۔ اس دوران اس نے اپنے گھر ٹیلیفون ملانے کے لئے آپریٹر کو کئی بار کہا مگر آپریٹر ہر بار کہتا کہ نمبر مصروف ہے۔ آخر وزیر نے جھنجھلا کر آپریٹر سے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟"

"جی نہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔" آپریٹر نے اطمینان سے جواب دیا۔

ستارہ انجم شیخ ..... ٹنڈو آدم

بوڑھا مصوّر

محمد محمود احمد

جولائی کا گرم سورج زمین پر آگ برسا رہا تھا۔ میں نے اپنی قمیص کے تینوں بٹن کھول دیئے۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ ابھی سورج چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر ان گھنے درختوں پر آگرے گا۔ اور پھر میں اس دن کو کوسنے لگا جب سیاحت کے شوق نے ہزاروں میل دور برِاعظم افریقہ کے چوتھے بڑے جزیرے مڈغاسکر میں لا کھڑا کیا تھا۔ آج مجھے نیلوفر کے وہ پھول بھی شدت سے یاد آرہے تھے۔ جنہیں گرمی کی شدت کم کرنے کے لئے میں کچے برتن میں بھگو کر پیا کرتا تھا۔ میں نے اپنے سفری بیگ سے آخری نارنیل نکالا ہی تھا کہ وہی بوڑھا مصور اپنے چہرے پر مسکراہٹوں کے رنگ بکھیرے میری جانب آتا دکھائی دیا۔ وہ ملک شام کا رہنے والا تھا۔ مگر دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جو اس کی بوڑھی آنکھوں نے نہ دیکھا ہو۔ وہ بہت سی زبانیں سمجھ لیتا تھا۔ میری اس سے کل شام ہی ملاقات ہوئی تھی۔ جب وہ ہاتھی دانت کے مجسموں کی ایک دکان سے کچھ خریداری کر رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں بے پناہ طلسم تھا۔ میں جب اس سے بغلگیر ہوا تھا تو مجھے اس کے دل کی دھڑکن اپنے دل میں صاف سنائی دی اور میں نے کہیں

سے سنا ہے کہ ایسے لوگ روحانی اور غیر معمولی طاقت کے مالک ہوتے ہیں۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور براعظم افریقہ کی سیر کرنے کے بعد وطن پہنچ کر سفر نامہ لکھنا چاہتا ہوں تو اس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ بیٹا! اگر وقت ملے تو اپنے اندر کی دنیا کا بھی سفر کرنا اور وہ سفر نامہ بھی ضرور لکھنا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں نے بانس کا ایک کمرہ کرائے پر لیا ہوا ہے۔ اب یقیناً وہ میری طرف ہی آرہا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے ناریل لیتے ہوئے کہا کہ اسے رہنے دو کیا تم نے جاپانیوں کی وہ بات نہیں سنی کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ ہم چائے پی کر گرمی کے خلاف جنگ کریں گے۔ اس نے اپنے کندھے سے تھرمس اتارتے ہوئے مجھے کپ لینے کے لئے بھیج دیا۔ میں بھاگ کر کپ لے آیا۔ اس نے دونوں کپ چائے سے بھر دیئے۔ میں کبھی درختوں میں پناہ گزین پرندوں کی کھلی چونچیں دیکھتا تو کبھی اس بوڑھے کی لمبی لمبی انگلیوں پر نظر پڑتی جنھوں نے چائے کے ایک بڑے کپ کو جکڑ رکھا تھا۔ ہم چائے کی چسکیاں لیتے رہے اور باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

اس بوڑھے مصور نے بتایا کہ اس کا نام صادق احمد المصباح شامی ہے۔ "مجھے اپنی صحیح تاریخ پیدائش تو یاد نہیں البتہ میں نے اپنی ماں سے سنا ہے کہ جس دن میں پیدا ہوا تھا اس دن ریڈیم جیسی عظیم دریافت کر کے دنیائے سائنس میں انقلاب برپا کرنے والی عورت مادام ماری کیوری نے ملک شام کا دورہ کیا تھا اور اس روز میرا باپ جو طبیعات کا استاد بھی تھا اس کے استقبال کے لئے گیا ہوا تھا۔"

اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے ماں باپ مجھے سائنس داں بنانا چاہتے تھے لیکن میں اپنے آپ کو تجربہ گاہوں میں مقید ہونے کی بجائے کھلی فضاؤں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے نیلے آسمان پر سفید اور نارنجی رنگ کے پرندے بہت اچھے لگتے تھے۔ فطرت کے مشاہدے نے ہی مجھے مصور بنا دیا۔ میں نے پھولوں کی پتیوں اور ریشم کے ریشوں سے بھی تصاویر بنائی ہیں۔ رنگوں سے ہاتھ رنگتے رنگتے بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرے باپ نے میری شادی ایک مصری خاندان میں کر دی۔ میرے ایک ہی بیٹا ہوا جو ان دنوں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ کیلیفورنیا میں آباد ہے۔ جبکہ میری بیوی کو فوت ہوئے گیارہ برس ہو چکے ہیں۔

میں اس بوڑھے مصور کی باتوں میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اب گرمی کا اثر بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کل مڈغاسکر سے مراکش کے لئے روانہ ہو جاؤں گا اس لئے آج رات میں آپ کے پاس رہ کر وہ تصویریں دیکھنا چاہتا ہوں جو آپ نے نہایت محنت اور لگن سے تیار کی ہوں گی۔ بوڑھے مصور نے بخوشی میری درخواست منظور کرتے ہوئے کہا، "کیوں نہیں! بلکہ میں آج رات کا کھانا تمہارے ساتھ کھانے میں خوشی محسوس کروں گا۔"

صادق احمد المصباح شامی کے جاتے ہی میں نے اپنا سامان باندھا۔ اپنے چند پاکستانی دوستوں کو خطوط لکھے اور جامعہ عربیہ مراکش کے پرنسپل کو اپنی آمد کی اطلاع کے لئے خط لکھا۔ جنہیں میری رہائش کا انتظام کرنا تھا۔ پھر اپنے مالک مکان کو کرایہ ادا کر کے اس بوڑھے مصور کے پاس جا پہنچا جو اپنے ایک فرانسیسی دوست کے پاس اس کے کارخانے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جہاں ریشمی و سوتی کپڑے، صابن، سیمنٹ، چینی اور گوشت ڈبوں میں بند کر کے مختلف ممالک میں بھیجے جاتے تھے اس کا کمرہ نہایت خوبصورت تھا۔ کھڑکی سے جزیرے کا تمام تر حسن نظر آرہا تھا۔ بوڑھا مصور مجھے تپاک سے ملا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کھانے کا وقت آپہنچا، کھانے سے فارغ ہو کر وہ اخروٹ کی لکڑی سے بنے ہوئے ایک منقش پیالے میں خشک شہتوت رکھتے ہوئے بولا۔ یہ لذیذ شہتوت ملک شام کے ایک زرخیز میدانی علاقہ نطکیہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور یہ پھل ہر ملک میں میرا ہم سفر رہتا ہے۔ پھر ہم دیر تک تصویروں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ شاعر لفظوں سے اور مصور رنگوں سے شاعری کرتا ہے۔ اس بوڑھے مصور کا ہر ایک فن پارہ رنگوں کی بہترین شاعری کہلایا جاسکتا تھا۔

اس نے تصویروں کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ ایک دن میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ کیوں نہ دنیا کے سب سے اچھے اور سب سے بُرے شخص کی تصویریں بناؤں۔ یہ واقعی ایک اچھا خیال تھا۔ جسے مجھے عملی جامہ پہنانا تھا۔ میں اس دن سے دنیا کے سب سے اچھے اور بُرے شخص تلاش میں رہنے لگا۔ چھ برس بیت گئے مگر مجھے ہر بُرے شخص میں کوئی اچھائی اور ہر اچھے شخص میں کوئی نہ کوئی عیب نظر آہی جایا کرتا تھا اور یوں ایک مرتبہ پھر میرا فن پارہ ادھورا رہ جاتا۔

آخر ایک دوپہر میں نے دنیا کا سب سے اچھا انسان تلاش کر ہی لیا۔ میں بیروت کے گلیوں سے گزر رہا تھا کہ مجھے ایک بوڑھا سا شخص نظر آیا۔ جس نے پیوند لگے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ زمین پر بیٹھا تھا اور سترہ لڑکوں نے اس کے گرد دائرہ بنا رکھا تھا۔ مجھے وہ بوڑھا شخص کوئی استاد لگ رہا تھا۔ لڑکوں کی رنگت اور لباس سے معلوم ہو رہا تھا کہ ان کا تعلق مختلف ملکوں اور مذاہب سے ہے۔ مگر شفیق انسان سب کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آرہا تھا اس کی زبان عربی تھی وہ اپنے شاگردوں سے کہہ رہا تھا۔ انسان اور جانور میں بنیادی فرق تعلیم کا ہے۔ محبت خدا کی طرف سے عطیہ ہے، جو انسان کو خاص طور پر بخشا گیا ہے۔ میرے بچّو! میرے بعد ایک دوسرے کو عیسائی، یہودی، مجوسی اور مسلمان کہہ کر آپس میں نفرت کی دیواریں کھڑی نہ کرنا، بلکہ تمہاری مثال بارش کے ان پاکیزہ قطروں جیسی ہونا چاہئے جو ہر شخص کی کھیتی پر برستے ہیں۔ محبت علم سے حاصل ہوتی ہے اور علم خدا کی پہچان ہے۔ میں اپنی زندگی کے سال اور مہینے پورے کر چکا ہوں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم تمام انسانیت سے پیار کرو گے۔ تاکہ

تمہارے دل اور تمہاری آنکھیں محبت کی روشنی سے چمک اٹھیں۔

بوڑھے مصور نے اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ یقیناً علم کے حصول کا درس دینے والا اور محبتوں کا پرچار کرنے والا ہی سب سے اچھا انسان ہو سکتا ہے۔ اس نے مجھے ایک تصویر دکھائی۔ ایک باوقار بوڑھا پیوند لگے کپڑے پہنے تھا۔ اس کے نرم و ملائم سفید بال تیز ہوا میں بکھر رہے تھے۔ چند لڑکے اس کے گرد آلتی پالتی مارے سبق پڑھ رہے تھے۔

جزیرہ مڈغاسکر کی راتیں کافی ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ اب دن کی گرمی اور لُو کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ باہر چودھویں کا پورا چاند پانیوں میں نہا رہا تھا۔ کبھی کبھار سمندری پرندوں کی آوازیں ماحول کو مزید خوشگوار بنا دیتیں۔ بوڑھے مصور نے وہ تصویر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا اور پھر میں نے دنیا کا سب سے بُرا آدمی بھی ڈھونڈ لیا۔

میرا دل بے ترتیبی سے ڈھڑک رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ وہ بُرا شخص جانے کہاں رہتا ہو گا جسے یہ تجربہ کار اور عمر رسیدہ شخص بھی بُرا سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

میں بے اختیار بول اٹھا! ''لیکن وہ آپ کو کہاں ملا؟ وہ کس ملک کا رہنے والا تھا؟ اور کیا کر رہا تھا؟ کیا آپ مجھے اس کی تصویر نہیں دکھائیں گے؟''

وہ بوڑھا مصور مسکراتے ہوئے بولا ''صبر کرو نوجوان! میں تمہیں وہ تصویر بھی ضرور دکھاؤں گا۔ وہ اٹھا اور بریف کیس سے ایک تصویر اٹھا لایا۔ میرا دل پورے زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور آنکھیں انتظار کی اذیت میں مبتلا ہوتی جا رہی تھیں۔

پھر اس نے تصویر سے پردہ اٹھا کر تصویر میرے سامنے کر دی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ یہ تو اس بڑھے مصور کی اپنی ہی تصویر تھی۔ الفاظ میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ''مگر آپ..... آپ تو نہایت اچھے اور مہربان آدمی ہیں۔ آپ دنیا کے سب سے بُرے انسان کیسے ہو سکتے ہیں۔

بوڑھے مصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! میں ہی وہ شخص تھا جو انسانوں کی اچھائیوں پر نظر رکھنے کی بجائے بُرائیاں تلاش کرتا رہا۔ ہمیشہ یاد رکھنا دنیا کا سب سے بُرا انسان وہ ہے جو اپنی خامیوں کو نظر انداز کر کے دوسروں کی بُرائیاں تلاش کرتا ہے اور میں ہی ایسا شخص تھا اس لئے اپنی تصویر بنا ڈالی۔

اس واقعے کو آج تین سال گزر چکے ہیں۔ مگر جب بھی کہیں تصویروں کی نمائش ہوتی ہے یا میں کسی مصور سے ملتا ہوں تو مجھے شام کا وہ بوڑھا مصور یاد آتا ہے جو مجھے افریقی جزیرے مڈغاسکر میں ملا تھا۔

میری پہلی تحریر

ہم نے کرکٹ کھیلی

محمد طارق شہاب ، ملتان

جب بھارت اور پاکستان کے درمیان ۱۹۸۷ء کو میچ کھیلے گئے تو پورے ملک میں کرکٹ ان دنوں اپنے عروج پر تھی ہم نے ایک جمعہ کو کرکٹ کھیلنے کا پروگرام بنایا ویسے کرکٹ تو ہم روز ہی کھیلتے تھے لیکن جمعہ کے دن کچھ خاص ہی پروگرام بنایا گیا تھا چنانچہ جمعہ بھی آگیا ہم نے کچھ پڑوس کے بچوں کو اکٹھا کر کے کرکٹ کی دو ٹیمیں بنالیں ایک ٹیم کے کپتان ہم بنے اور دوسری ٹیم کے ہمارے بھائی۔ ٹاس کرایا گیا جس میں ہم نے ٹاس جیتا اور پہلے کھیلنے کا فیصلہ کیا ہماری مخالف ٹیم کے فیلڈر فیلڈنگ کے لئے میدان میں آگئے حریف ٹیم کے کپتان نے کہا میں تو عمران خان بنوں گا اور بولنگ کے لئے میدان میں آگیا میں بھی کم نہ تھا میں نے کہا میں ظہیر عباس بنوں گا۔ اس طرح سے دوسرے لڑکوں نے بھی اپنے اپنے نام منتخب کر لیئے۔ میں نے گھر سے ایک عدد چشمہ اور دو رومال منگا لیئے جب یہ چیزیں آگئیں تو ایک رومال سر پر باندھا اور دوسرا گلے میں چشمہ لگانا بھول گیا اس کے بعد میدان میں آگیا میرے ساتھ کھیلنے کے لئے میرا دوست تھا بولنگ شروع ہوئی یہ بولنگ ہمارے بھائی جو عمران خان بنے تھے کرا رہے تھے پہلی گیند پر ایک شاندار چوکا لگایا اور دوسری گیند پر میں ایک سکور لینے میں کامیاب ہو گیا ہمارے بھائی جنہوں نے عمران کا بھیس بدلا ہوا تھا کہنے لگے ظہیر صاحب چشمہ آپ گھر بھول آئے ہیں میں نے جب یہ سنا تو جلدی سے جیب میں رکھا ہوا چشمہ نکالا اور پہن لیا چشمہ دراصل دادا جان تھا جس میں دور کی چیز نزدیک اور بڑی دکھائی دیتی تھیں۔ ہاں تو پھر بولنگ شروع ہوئی ہمارے دوست نے ایسا شارٹ مارا کہ گیند باؤنڈری لائن پر بیٹھے ہوئے ایک بچے کے سر پر لگی جس کی وجہ سے بچہ رونے لگا رونے کی آواز سن کر اس کا بھائی بھاگا ہوا آیا اس نے بچے سے پوچھا کس نے مارا ہے تو بچے نے میری طرف اشارہ کیا وہ لڑکا میرے قریب آیا اور بولا "او چھوکرے" مجھے غصہ آیا میں نے کہا میں چھوکرا وو کرا نہیں ہوں اگر دوبارہ کہا تو دیکھ رہے ہو میرے پاس کیا ہے۔ میں نے بیٹ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا لڑکا بولا دیکھ رہا ہوں کپڑے دھونے کا ڈنڈا ہے اور آپ کو کسی نے مارا بھی ہے جب ہی تو سر پر پٹی اور گلے میں..... میں نے بات کاٹ کر کہا یہ ڈنڈا نہیں ہے بلکہ ایک بیٹ ہے اور ہاں یہاں سے جلدی سے نو

دو گیارہ ہو جاؤ ورنہ..... خیر لڑکا چلا گیا بولنگ پھر شروع ہوئی میرے ساتھی نے پھر ایک شارٹ مارا جس میں تین رنز بنتے لیکن میں نے جو چشمہ پہنا ہوا تھا اس نے مشکل سے ایک رن بنانے دیا کیوں کہ میں وکٹ کی طرف بھاگتا تو چشمے میں دور کی چیزیں بہت ہی قریب دکھائی دیتی تھیں لہٰذا جب میں بھاگا تو وکٹ میرے قریب نظر آئی اور میں نے اپنی رفتار آہستہ کر دی اس طرح میں وکٹ سے تین چار گز کے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا کیوں کہ چشمے میں وکٹ میرے قریب ہی تھی میرا ساتھی چیخ کر کہہ رہا تھا کہ یہاں مت رکو آگے بھاگو نہیں تو گیند لگا کر وکٹ گرا دیں گے کم بخت چشمے کی وجہ سے سر الگ چکرا رہا تھا مخالف ٹیم فیلڈر نے اتنا اچھا موقع دیکھا تو گیند وکٹوں پر ماری لیکن خوش قسمتی سے وکٹ گرنے سے بچ گئی اور گیند دور جا گری اس وقت بھی میں اسی حالت میں کھڑا تھا یعنی وکٹ سے تین چار گز دور اچانک مجھے خیال آیا کہ چشمہ اتار کر دیکھوں چشمہ اتارا تو اپنے آپ کو وکٹ سے دور پایا پھر جلدی سے میں بھاگ کر وکٹ کے قریب پہنچ گیا بولنگ دوبارہ شروع ہوئی اور میں نے چشمہ پھر پہن لیا۔

اب کی بار میں نے گیند آنے سے پہلے ہی بیٹ گھما دیا جس کی وجہ سے گیند بیٹ کو نہ لگی اور سیدھی کمر پر جا لگی یہ عمل ہمارے بھائی جان عمران خان کے اوور تک جاری رہا اس کے بعد بھائی کے دوست جو سرفراز نواز بنے ہوئے تھے انہوں نے ہمارے دوست کو اوور کرایا ان کے اوور کی دوسری گیند پر میرے دوست نے ایک شاندار شارٹ مارا جس کی وجہ سے مخالف ٹیم کے تقریباً تمام ہی فیلڈرز اس گیند کے پیچھے بھاگے اور اس وقت میں پھر چشمہ پہنے کھڑا تھا ہم دونوں نے مل کر رن بنانا شروع کئے میں جیسے ہی بھاگا پھر مجھے وکٹ اپنے قریب نظر آنے لگی میں نے سوچا یہ کم بخت چشمہ مجھے دھوکا دے رہا ہے حالانکہ اب میں وکٹ سے تھوڑے فاصلے پر تھا میں تو پوری تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا جس کی وجہ سے میں وکٹ سے بری طرح ٹکرایا اور بری طرح زخمی ہوا اور چشمہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا جب میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو تمام بچے میرے گرد جمع ہو گئے اور قہقہے لگانے لگے جس بچے کی سر پر گیند لگی تھی وہ تو خوشی سے ناچ رہا تھا اس واقعہ کے بعد میں نے ظہیر عباس بننے سے توبہ کر لی۔

"ہم نے کہانی لکھی"

زاہد مغل، حیدر آباد

دل دل پاکستان میں "میری پہلی تحریر" کے عنوان سے اشتہار شائع ہوا تو میں سوچنے لگی کہ مجھے بھی کچھ لکھنا چاہئے اور پھر ہم پر بس بھوت سوار ہو گیا کہ ہم کچھ نہ کچھ لکھ کر ادیب کہلائیں لہٰذا اس کے لئے ہم نے سب سے پہلے بڑے بھائی کے کمرے کا رخ کیا۔ ارے ارے اس لئے نہیں کہ بڑے بھائی سے کچھ لکھوا کر لائیں بلکہ اس لئے کہ سفید کاغذ چاہئے لکھنے کے لئے کیوں کہ ہم نے اکثر بھائی کو سفید کاغذوں کو کالا کرتے دیکھا ہے کالے کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ انک لے کر کاغذ پر گرا دیں بالکل نہیں وہ اکثر کالی انک سے سفید کاغذوں پر لکھتے ہیں اور پوسٹ کر آتے ہیں اب پتہ نہیں ان کی تحریر شائع ہوتی ہے کہ بس ردی کی ٹوکری میں چلی جاتی ہے اور..... ارے ہم کس بحث میں الجھ گئے خیر ہم سفید کاغذ بھائی کے کمرے سے اٹھا لائے اور بڑے بکس میں سنبھال کر رکھ دیئے رات کو جب سب سو گئے تو ہم نے بکس سے کاغذ نکالے اور لیمپ کی روشنی میں کہانی لکھنے لگے۔

"بہت دنوں کی بات ہے کسی ملک پر ایک ظالم حکمران حکومت کرتا تھا وہ اپنی مرضی چلاتا اور" ابھی ہم نے یہ لکھا

تھا کہ ہمیں کھڑکی کے پاس دو سائے نظر آئے تو ہم سمجھے یہ وہم ہے مگر ان سایوں نے دوبارہ حرکت کی تو ہم چونک گئے ڈر لگنے لگا مگر ہم نے ہمت کر کے کھڑکی کے پاس آکر پکارا کون ہے۔

جواب میں مکمل خاموشی رہی میں نے ہمت کر کے دروازہ کھولا مگر وہاں کوئی نہیں تھا جب ہم کمرے میں آئے تو یہ دیکھ کر ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ جس صفحہ پر ہم کہانی لکھ رہے تھے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا پورے کمرے میں بکھرا پڑا تھا ابھی ہم خوف سے چیخنے والے تھے کہ کسی نے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اس کے بعد کیا ہوا ہمیں نہیں معلوم۔ ہمیں ہوش آیا تو اپنے آپ کو پلنگ پر پایا گھر والے سب پریشان کھڑے تھے "کیا ہوا زاہدہ" امی نے پیار سے کہا "امی وہ بھوت تھے" ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں کیا بتائیں "تم کیا کسی بھوت سے کم ہو" چھوٹے بھائی نے ہمیں چھیڑا۔

جب ہمیں حقیقت کا پتہ چلا تو گھر والوں کے سامنے بہت ندامت ہوئی ہوا یوں کہ ہم نے رات کو فلم دیکھی تھی اور اس میں بھوت تھے جو لڑکی کو لے جاتے ہیں اور مار دیتے ہیں ہم اس فلم کو حقیقت سمجھ بیٹھے اور ڈر کر بے ہوش ہوگئے۔

ہم نے رات کو فلم دیکھنے سے توبہ کرلی اور رات کو دیر سے میری پہلی تحریر لکھنے کے خیال کو دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال دیا۔ **علیم الرحمٰن عالی ۔ گوجرانوالہ**

ٹک سٹر

سبین فاطمہ کراچی

نام تو ان کا خدا ہی جانے کیا تھا مگر سب انہیں خالہ ٹک سٹر کہہ کر پکارتے تھے جب بھی وہ ہمارے محلے کی طرف اپنے آدھے درجن بچوں کے ساتھ چہل قدمی فرماتیں تو محلے کے بچے انہیں "پرانے زمانے کی خالہ، آفت کی پرکالہ" کہہ کر پکارتے تھے مزے کی بات یہ کہ نہ صرف یہ کہ لاٹھی ٹیک کر چلتی تھیں بلکہ وہ اپنی چپل (جو شاید ہٹلر کے زمانے میں نئی رہی ہوگی) گھسیٹ کر بھی چلتی تھیں جس کی وجہ سے ہم لوگ انہیں "ٹک سٹر" کہتے تھے یعنی جب وہ لاٹھی ٹیکتی تھیں تو ٹک کی آواز آتی اور جب چپل گھسیٹتیں تو "سٹر سٹر" آواز آتی تھی مگر "ٹک سٹر" ہم لوگوں کا کوڈ ورڈ تھا۔ ہم ان کے سامنے کبھی کہنے کی جسارت نہیں کرسکتے۔

ایک دن ہماری کم بختی آئی۔ ہم اپنا چھٹیوں کا کام کررہے تھے کہ ..... دروازہ پر دھڑ دھڑ ہونے لگی ہم سمجھے کہ شرپسندوں نے حملہ کردیا ہے خیر آیۃ الکرسی کا ورد کرتے ہوئے دروازہ کھولا تو اوسان خطا ہوگئے کیوں کہ "بقول ہمارے "ٹک سٹر، اپنے آدھے درجن بچوں کے ساتھ موجود تھیں ہم امی کو بتا کر واپس دروازے پر آئے تو یہ دیکھ کر باچھیں کھل گئیں کہ "ٹک سٹر" دروازے پر موجود نہیں تھیں مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی کیوں کہ آدھے درجن بچے اندر باجی کا کمرہ کھولنے کی کوشش میں سرگرداں تھے بہرکیف ہم اپنے کمرے کی طرف بھاگے اور اپنا بستہ شہید ہونے سے بچالیا اور اوپر والی منزل میں رکھ آئے ہم سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ "اڑاڑا دھم" یعنی ہم زمین بوس ہوگئے یہ سوچ کر کہ گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔ اٹھے دو قدم چلے پھر پھسل گئے تب ہم پر یہ راز افشاں ہوا کر سیڑھیوں پر گوند سے پوچا لگایا گیا ہے اور یہ کام یقیناً ٹک سٹر کی بیٹی کا تھا جو پانچ سال کی تھی ہم اس کی مرمت کرنے کمرے میں پہنچے تو یقین جانئے ہمارا دل چاہا کہ ہم جوتا اتار کر اپنا سر پیٹ لیں اس لئے کہ قالین پر سیاہی سے تجریدی آرٹ کا شاہکار بنا دیا گیا تھا علاوہ ازیں کسی نے باتھ روم کا نلکا کھول دیا تھا اور ہمارا کمرہ تربیلا ڈیم بنا ہوا تھا اوپر سے ستم یہ کہ ہمارے

تکیے کو بطور کشتی استعمال کر کے کشتی رانی کی جارہی تھی۔ ہم یہ دیکھ کر زور سے چیخے تو سارے بچے فرماں برداری کا ثبوت دیتے ہوئے چیخنے لگے بڑی مشکل سے ایک ایک روپیہ دے کر چپ کرایا اتنے میں ٹک سٹر نے آواز لگائی چنو ، منو ، بچو آجاؤ حلوہ کھالو یہ جملہ ہمارے لئے زہر سے بھی کڑوا ثابت ہوا کیوں کہ وہ حلوہ جو کہ اب ناپید ہے امی نے ہماری سہیلیوں کے لئے بنایا تھا جو شام کو آنے والی تھیں۔

اب رونے سے کیا ہو ، جب بچے چگ گئے حلوہ

بہرحال تقریباً رات بارہ بجے کے قریب یہ طوفان بدتمیزی ٹلا اور ہم مسکین سی صورت بنا کر گھر ٹھیک کرنے چل دیئے۔

حضرت عمر فاروقؓ

دنیا میں بہت سی اللہ کی برگزیدہ ہستیاں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں لیکن اپنا نام لوگوں کے لبوں پر چھوڑ جاتی ہیں انہی ہستیوں میں سے ایک حضرت عمر فاروقؓ بھی تھے آپؓ خلیفہ دوئم تھے اور حضورؐ کے جان نثار ساتھی تھے آپ جس مملکت پر حکومت کرتے تھے وہ پاکستان ، ہندوستان ، بنگلہ دیش ، سری لنکا کو ملا کر بھی چار گنا تھی اتنی بڑی سلطنت میں آپ رعایا کا خاص خیال رکھتے اور عام آدمی کے روپ میں پوری مملکت میں گشت کرتے اور ان کی مدد کرتے تھے اتنی بڑی سلطنت کے بادشاہ کی کیسی شان ہوتی ہے لیکن آپ سادگی سے زندگی گزارتے تھے یہاں تک کہ آپ زمین پر تکیہ کی جگہ دو اینٹیں استعمال کرتے آپ کے کپڑے میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوتے ایک دفعہ جمعہ کی نماز میں آنے میں دیر ہوگئی تو آپ نے سب سے معذرت سے کہا کہ مجھے اپنے کپڑے دھونے اور سکھانے میں دیر ہوگئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کس قدر سادگی پسند تھے اکثر نماز تہجد میں روتے روتے گر پڑتے اور کئی دن تک بیمار رہتے نماز فجر میں اکثر سورۃ طٰہٰ اور سورۃ کہف کی تلاوت کرتے وقت اس قدر روتے کہ کئی صفوں تک آواز جاتی ایک دفعہ فجر کی نماز میں سورۃ یوسف کی تلاوت کررہے تھے کہ رونے کی وجہ سے آواز نہ نکلی۔

آخری دنوں میں جیسا ان کی پسلیوں سے خون بہتا تھا اور سارا کھانا باہر آجاتا تھا تب انہیں نماز کے لئے منع کیا جاتا تو آپ کہتے کہ بے شک جس نے نماز نہ پڑھی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں اور اسی حالت میں نماز ادا کرتے یہ تو ان کی سادگی اور پرہیز گاری کا حال تھا اگر سارے لوگ ایسے ہو جائیں تو شاید دنیا جنت بن جائے۔

جاوید علی) مانی کراچی

احساس

"جلیل بیٹے!" چلو اٹھو نماز کا وقت ہوگیا ہے دادی امی کی یہ آواز سن کر میں چڑ سا گیا "روز ہی آجاتی ہیں جگانے ، اچھی طرح سونے بھی تو نہیں دیتی ہیں" میں نے دل میں سوچا اور بُرے بُرے منہ بناتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹے یوں مذہب سے بے زاری اچھی بات نہیں دیکھو اسلام ہی راہ نجات ہے اسی دین کی راہ ہم کو جنت تک لے کر جائے گی"

دادی امی نے حسب معمول نصیحت کی۔

"دادو! آخر نماز کا فائدہ ہی کیا ہے؟ دنیا کے اتنے سارے کام ہیں سب کے کرنے کا کوئی نہ کوئی فائدہ تو ہے نماز سے کیا مل جاتا ہے؟" میں نے اس روز مکمل بغاوت کی ٹھان لی تھی ایک لمحہ کو دادی امی کے چہرے پر ناراضگی کی سختی ابھری مگر جلد ہی وہی برسوں کی شفقت بھری نرمی نظر آنے لگی۔

"منّو! تم ابھی چھوٹے ہو اتنی جلدی میری بات نہ سمجھ پاؤ گے۔ تم جلدی سے وضو کرو میں کل تمہاری بات کا جواب دوں گی" دادی امی نے پیار سے بات کی اور میں نا چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اونہہ" میں نے دل میں کہا اور نماز کی تیاری کرنے لگا اگلے دن دادی امی نے ابو جان کو نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ اس روز سے میری پاکٹ منی نہ دی گئی میں دل میں بہت جھنجلایا ابو جان کی سخت طبیعت کی وجہ سے میں نے زیادہ اصرار نہ کیا اور خالی جیب ہی سکول چلا آیا ہاف ٹائم میں میری بے بسی قابل دید تھی۔ طرح طرح کے ٹھیلے آج زیادہ ہی پرکشش محسوس ہو رہے تھے فروٹ چاٹ آلو چھولے اور دہی بھلے دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا مگر جیب میں کچھ ہوتا تو دل کی تمنا پوری ہوتی اس روز مجھے خود پر اور دادی امی پر بڑا غصہ آرہا تھا پڑھائی میں بھی دل نہ لگا گھر واپس آیا تو دادی امی نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا ان کی مسکراہٹ مجھے اس دم زہر لگی۔

"میں جانتی ہوں تم بہت ناراض ہو دادی امی نے میرا ماتھا چوما اور پھر بولیں تم کھانا کھالو پھر میں تم کو تمہارے سوال کا جواب دوں گی۔" کھانے کے بعد دادی امی مجھے ایک الگ کمرے میں لے آئیں اور انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"جلیل! دیکھو اب تک تم کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہو گا میرا مطلب ہے کہ آج جب تم کو پاکٹ منی نہیں ملی تو تم کو کتنا غصہ آیا تم اپنی من پسند کوئی چیز نہ کھا سکے بالکل اسی طرح نماز اور دوسری عبادتیں ہم مسلمانوں کے لئے پاکٹ منی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے ہم کو جنت کی نعمتیں اور راحتیں نصیب ہوں گی ہمارے پاس جتنی زیادہ پاکٹ منی ہو گی ہم کو اس کا اتنا ہی زیادہ اجر ملے گا اگر ہمارے پاس نیکیوں کی دولت نہ ہو گی تو ہم آخرت کے دن کچھ بھی نہ خرید سکیں گے اور بھوکے پیاسے رہ جائیں گے بالکل اسی طرح جیسے آج تم سکول میں رہے میرا خیال ہے کہ اب تم میری بات سمجھ گئے ہو گے؟" دادی امی کی باتیں میں بڑے غور سے سن رہا تھا اور ایک ایک بات سمجھ رہا تھا ..... میرا احساس اب جاگ چکا تھا اگلی صبح میں دادی امی کو جگا رہا تھا "دادی جان! اٹھئے نماز کا وقت ہو رہا ہے" اور دادی امی نے آنکھیں کھولیں تو خوشی سے میرا ماتھا چوم لیا۔

انتظار

فرحت جبیں کراچی

بابا او بابا "میں اسکول جاؤں گا" ہاں بیٹا کیوں نہیں میں کل تجھے خود تیرے اسکول چھوڑ آؤں گا نہیں نہیں میں ابھی اپنے اسکول .....

احمد دین نے ناصر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایک زور دار طمانچہ ناصر کے منہ پر رسید کر دیا اور خود غصہ میں باہر چلا گیا۔

"ناصر کے ماں باپ ناصر سے بڑا پیار کرتے تھے لیکن غربت اور آئے دن کے ہنگاموں کی وجہ سے ناصر کے بابا اپنی دکان کھول نہیں سکتے تھے جو کہ ایک معمولی سی پرچون کی دکان تھی۔

ناصر اپنی ماں کے گلے لگ کر خوب رویا اس کی ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے لیکن وہ بہت سمجھ دار تھیں اس لئے فوراً ناصر کو خوب پیار کیا اور بڑے پیار بھرے لہجہ میں اس سے کہنے لگیں کہ "بیٹا میری بات غور سے سُن! دیکھ تیرے بابا کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ میں اور تیرے بابا اپنا پیٹ بھر سکیں مگر جب تو اس دنیا میں آیا تو میں نے اور تیرے بابا نے اپنا پیٹ کاٹ کر تیری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی اور تجھے اسکول بھی داخل کروایا مگر میری جان! اس شہر میں چند سالوں سے خون اور آگ کا کھیل کھیلا جا رہا

ہے جس کی وجہ سے تیرے بابا اپنی چھوٹی سی دکان کھولنے سے گھبراتے ہیں کیوں کہ ہمارے پاس روزی کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے جو اگر ہم سے چھین لیا گیا تو بیٹا ہم جو یہ دو وقت کی روٹی کھا رہے ہیں وہ بھی نہ کھا سکیں گے اس لئے میرے چاند تیری تین ماہ کی اسکول کی فیس ہم نہیں دے سکے ہیں اس لئے ماسٹر نے کہلوایا ہے کہ جب تک پورے تین ماہ کی فیس نہ بھیجی جائے تو تمہیں اسکول میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا اس لئے بیٹا چند دن اور صبر کر لو انشاء اللہ شہر پھر سے روشن ہو گا اور تمہارے بابا بھی خوب پیسے اکٹھے کر لیں گے تو تم بھی خوشی خوشی اسکول چلے جانا ناصر یہ تمام باتیں سن کر یکدم رو پڑا اور امی سے ایک بار پھر گلے لگ کر خوب رویا اور معافی بھی مانگی کہ اب وہ اپنے اتنے پیارے والدین کو ہر گز تنگ نہ کرے گا جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے لئے اتنی محنت کرتے ہیں اس نے یہ عہد بھی کیا کہ وہ اس وقت تک انتظار کرے گا جب اس کا پیارا شہر پھر سے خوب روشن اور چاند کی طرح منور ہو جائے گا۔

"ملٹری کالج کا پہلا دن"

کیڈٹ علی احمد قریشی ۔ سرائے عالمگیر

"ارے سنو! وہاں جانا منع ہے" اس کرخت آواز نے مجھے چونکا اور گھبرا دیا میں جو شتر بے مہار کی طرح چلا جا رہا تھا فوراً مڑا اور لڑکے سے پوچھا "مگر کیوں" جواب ملا "اٹ از مائی آرڈر" (یہ میرا حکم ہے) مجھے غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر لیا۔

دراصل یہ میرا ملٹری کالج جہلم میں پہلا دن تھا اور مجھے روکنے والا لڑکا میرا سینئر تھا داخلے کا خط ملتے ہی خوشی خوشی سامان پیک کر کے لاہور سے سرائے عالمگیر پہنچ گیا اور پہلی دفعہ اس کالج پر غور سے نظر ڈالی۔

گیٹ پر بے انتہا بھیڑ تھی گھوے سے گھوا چھلتا تھا میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس کالج کے طلباء کا انتخاب پوری دنیا کے ہزاروں لڑکوں میں سے ہوتا ہے جن میں سے صرف ۱۰۰ طلباء منتخب کئے جاتے ہیں والدین کی دعاؤں اور کوششوں، میری انتھک محنت اور خدا کے فضل و کرم سے میں ان ۱۰۰ میں شامل ہو چکا ہوں اس بات پر ہی میں بہت خوش تھا۔

گیٹ پر تمام کاغذات وغیرہ مکمل کر کے اپنے مقرر کردہ ہاؤس یعنی محمود غزنوی ہاؤس میں پہنچا یہاں بھی طلباء اور ان کے احباب کی وجہ سے تل دھرنے کی جگہ نہ تھی تقریباً ۱۲ بجے کالج کے کمانڈنٹ کا لیکچر ہوا جنہوں نے ہمیں مبارک باد اور حوصلہ دیا اس کے بعد واپس اپنے ہاؤس میں آ گئے جہاں ہمیں الاٹ کردہ کمروں میں بٹھایا گیا۔

ان کمروں میں اپنا اپنا ٹرنک رکھنے کے بعد ہم نے حجام سے حجامت بنوائی کیڈٹ کٹ ہمارے لئے بہت عجیب تھی اس کٹ کے بعد ہم گدھوں کی طرح گردن سے ننگے ہو گئے اس کے بعد ہم نہائے دھوئے اور دوبارہ کالج دیکھنے نکل پڑے۔

واپس آ کر ہم نے الماری سیٹ کی اور لیٹ گئے۔ مگر کچھ سینئر صاحبان آئے اور ہماری سیٹنگ کو مسترد کر دیا اور اپنی نئی سیٹنگ کا بتایا چنانچہ ہم نے از سر نو سیٹنگ کی اور اس کے بعد آرام کیا شام کو مغرب کی نماز پڑھی اور پھر ڈنر کیا رمضان کے دن تھے اسی لئے رات کو تراویح کے لئے گئے اور وہاں سے واپسی پر بیڈ پر لیٹ گئے۔

اس طرح پہلا دن گزرا ہم یہاں سب سے جونیئر تھے جس کی وجہ سے سینئر کا رویہ ہم سے ٹھیک نہ تھا پھر بھی وہ سال خیریت سے گزر گیا پہلے سال کے بعد اب دوسرا سال اس کالج میں آہستہ آہستہ اپنی اختتامی منزل کے قریب ہے۔ میں یہاں اس کالج میں اس لئے تکالیف برداشت کر رہا ہوں کیوں کہ میں ایک ملٹری

آفیسر کی حیثیت سے پاکستان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں دل میں شہادت کی آرزو ہے اور دماغ میں پاکستان کی خدمت کا منصوبہ۔ آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں تاکہ اپنے نیک مقاصد میں کامیاب ہو جاؤں اور شہادت کا بلند رتبہ پا کر اس ملک کے لئے کچھ کر جاؤں تاکہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکوں خدا میرا مدد گار ہو۔

(آمین)

آپ کے مشاہدے کا امتحان

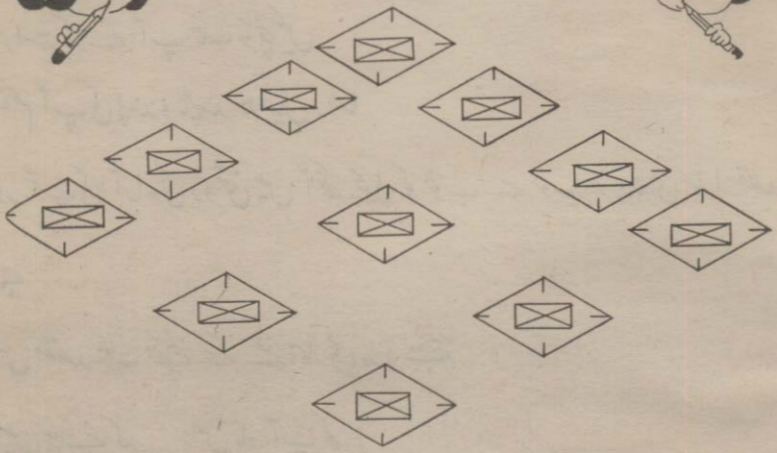

گیارہ ہیروں پر چار سیدھے خط اس طرح کھینچئے کہ قلم اُٹھنے نہ پائے۔

اس ماہ آپ کو آنکھ مچولی کیسا لگا

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ

آنکھ مچولی کو معیاری تحریروں کے حسن سے

آراستہ کر کے آپ تک پہنچائیں

تاہم آپ کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا

اور آپ کی آراء کی روشنی میں آنکھ مچولی کو خوب سے خوب تر بنانا ہی ہمارا مقصد

ہے

اس مقصد تک پہنچنے کے لئے ہماری مدد کیجئے

ہمیں بتائیے کہ ...... اس ماہ آپ کو

...... آنکھ مچولی میں سب سے بہترین تحریر کون سی لگی ؟

...... آپ کے خیال میں کمزور ترین تحریر کون سی تھی

تمام تحریروں کو پسندیدگی کے اعتبار سے ترتیب دیجئے

اور ہمیں لکھ بھیجئے ...... آپ کی رائے ...... آنکھ مچولی

کے معیار میں بہتری کی سمت ہماری معاون ہوگی

نئے لکھنے والوں کی مختصر تحریروں کا مستقل سلسلہ

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

ننھی نگارشات کی جگہ اب کم سن قلم کار نے لے لی ہے۔ آپ اگر واقعی کم سن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کے لئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہوسکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلم کار کا نام پتا درج نہ ہوگا اُسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک لسٹ" برقرار رہے گا۔ کم سن قلم کار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلم کار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کم سن قلم کار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔

(ادارہ)

نعت

خالد بلال..... کراچی

اے رسول ؐ خدا، اے حبیب ؐ خدا
آپ کا مرتبہ سب سے اونچا رہا

آپ ؐ ہی نے سنایا پیام خدا
آپ ؐ ہی نے دکھایا صحیح راستہ

آپ ؐ کے دم سے دونوں جہاں پر رہا
وہ اجالا کہ تا عمر جاری رہا

آپ ؐ پر نور قرآن نازل ہوا
آپ ؐ پر بھیجتے ہیں درود و دعا

اے رسول ؐ خدا، اے حبیب ؐ خدا
آپ ؐ کا مرتبہ سب سے اونچا رہا

دوسرا رخ

مرسلہ...... سہرین مسعود

اس کو بہت شوق تھا کہ وہ بڑا ہو کر استاد بنے۔ آپ کو حیرت تو ہو رہی ہوگی کہ لوگ تو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے لئے سوچتے ہیں اور یہ استاد بننے کا ارادہ رکھتا تھا۔ امی بھی اس سے بہت مرتبہ کہہ چکی تھیں کہ نعمان اور بچے تو ڈاکٹر، انجینئر بننا چاہتے ہیں "بیٹا تم استاد بننے کا خیال چھوڑ کر کسی اچھی فیلڈ میں جانے کا خیال رکھو۔" نعمان کی امی جہاں دیدہ عورت تھیں وہ جانتیں تھیں کہ استادوں کا ہمارے معاشرے میں کیا مقام ہے؟ لیکن وہ تو بچہ ہی تھا پانچویں جماعت کا طالب علم۔ اس لئے اس کو تو یہ سمجھ میں نہ آتا کہ امی اسے کیوں استاد بننے سے روک رہی ہیں۔ کیونکہ جب کبھی بھی یہ ہمارے اسکول آتی ہیں تو ہماری مس سے اتنے اچھے طریقے سے بات کرتی ہیں اور پھر سبھی کی امیاں ہی مسوں سے اچھی طرح بات کرتی ہیں خالد کی امی بھی اور راشد کی امی بھی!

اور پھر جب اس کا ذہن کسی بات کا جواب نہ دے پاتا تو وہ کسی سوچ میں کھوئے کھوئے کہتا "امی مجھے استاد بہت اچھے لگتے ہیں شاید اسی لئے۔" نعمان کو یاد ہے جب اس کی خالہ امریکہ سے آئی تھیں تو انہوں نے وہاں کے بہت سارے قصے اس کو سنائے تھے۔ وہاں کے اسکولوں کے بھی، وہاں کے طالب علموں کے اور استادوں کے بھی، اور شاید یہی باتیں اس کے ننھے سے ذہن میں ثبت ہو کر رہ گئیں تھیں کہ استادوں کی عزت کا کوئی مقابلہ نہیں کیونکہ وہ روحانی والدین ہوتے ہیں اور جب ہی سے اس نے بھی استاد بننے کا سوچ رکھا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے استادوں کی بہت عزت کرتا تھا۔ ان کا بتایا ہوا کوئی

چھوٹا سا کام بھی اسے ڈھیروں مسرتوں سے ہمکنار کر جاتا۔

آج اسکول کے تمام ہی بچے خوش تھے۔ کیونکہ اگلے دن سے ان کے اسکول میں سینٹر بن رہا تھا۔ کیونکہ یہ ایک بہت بڑا اسکول تھا اور زیادہ گنجائش کی وجہ سے اس میں اکثر و بیشتر سینٹر بنتے رہتے تھے۔ اس لئے سب جانتے تھے کہ کل سے ان کی چھٹیاں ہو جائیں گی اور ہوا بھی یہی۔ اسکول میں کل سے چھٹیوں کا اعلان کر دیا گیا، سوائے پانچویں جماعت کے اور وہ اس لئے کہ ان کے امتحان نزدیک تھے۔ میڈم نے اپنے کمرے سے ملحقہ ایک کمرہ پانچویں جماعت کے لئے وقف کروا دیا تھا۔

نعمان دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔ یوں وہ تھا بھی ایک محنتی بچہ۔ اس لئے وہ خوشی خوشی اگلے دن اسکول کے لئے تیار ہو گیا۔ "ارے نومی بیٹا کہاں جا رہے ہو؟ کل تو ہمارے پڑوسی کلیم صاحب کا لڑکا بتا رہا تھا کہ تم لوگوں کی چھٹیاں ہو گئی ہیں۔" نعمان کی امی نے اسے ناشتے کی میز پر تیار بیٹھے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"وہ امی دراصل امتحانات کی وجہ سے ہمیں ایک ہفتے تیاری کے لئے اور بلایا گیا ہے۔" نعمان نے کرسی کی پشت پر لٹکا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا، "اچھا بیٹا اللہ حافظ" امی نے دروازے سے نکلتے ہوئے نعمان کو کہا۔ "اللہ حافظ امی جی" نعمان نے مڑ کے مسکراتے ہوئے کہا۔

آج اسکول میں بہت رش تھا۔ بڑے بڑے لڑکے ادھر ادھر ٹولیاں بنائے باتیں کر رہے تھے۔ کسی کونے سے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں اور کسی سے زور زور سے باتیں کرنے کی۔ اس کی جماعت کے دو چار لڑکے کلاس کی طرف جارہے تھے۔ وہ جلدی جلدی ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ جانے کیوں اسے یہ سب عجیب سالگ رہا تھا ان کے تو امتحان ہو رہے ہیں اور یہاں تو ایسا لگ رہا ہے جیسے سب کسی تقریب میں ایک دوسرے سے مل جل رہے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد باہر کا شور کم ہوا تو ان کی ٹیچر کلاس میں آگئیں۔ انہوں نے بڑے پیار سے انہیں امتحان کے طریقۂ کار کے متعلق سمجھایا اور پھر پڑھائی میں مصروف ہونے کے بعد انہیں وقت گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلا۔ ویسے بھی آج چھٹی معمول سے پہلے ہوگئی تھی۔ وہ ٹیچر کی ہدایت کے مطابق لائن بنا کر کلاس سے باہر آگئے۔ نعمان سب سے آخر میں آرہا تھا۔ ایک کمرے سے آتے شور کی آواز سن کر وہ ایک کھڑکی کے پاس رک گیا اس نے دیکھا کلاس میں کچھ عجیب سی صورتحال تھی۔ لڑکے دھڑلے کے ساتھ کے ایک دوسرے کو نقل کے پرچے لے اور دے رہے تھے۔ اور اس کمرے میں موجود نگراں استاد خاموشی کے ساتھ گردن گھمائے کمرے سے باہر دیکھ رہے تھے۔ ایسے جیسے انہیں کچھ خبر ہی نہ ہو کہ کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ نعمان نے سوچا کہ وہ انہیں اس جانب متوجہ کرے۔ لیکن پھر وہ یہ سوچ کر اپنے ارادے سے باز رہا کہ کہیں وہ اسے جھڑک ہی نہ دیں۔ نعمان چند لمحوں تک کمرے کا نظارہ کرتا رہا۔ پھر وہ دکھے دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ گھر کی جانب چل پڑا۔ اس کے دماغ میں ایک لفظ زور زور سے گونجنے لگا۔ استاد..... استاد..... استاد..... نعمان کو لگا اس کے ذہن میں استاد کی تصویر کے رنگ دھندلے پڑ گئے ہیں۔

وطن کا مجاہد

نفیس احمد خان۔ کوٹری

ذیشان کے ہاتھ میں آج کا تازہ "اخبار" تھا، اور اس کے قدم لحہ بہ لحہ گھر کی جانب اٹھ رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے آواز لگانا شروع کر دی:۔ "امی جی۔" "امی جی" آپ کہاں ہیں۔ ذرا ادھر تو آیئے دیکھئے آج آپ کے بیٹے نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔" اسکی آواز تیز ہوگئی۔ اسکی امی زینے سے اترتی ہوئی آئیں:۔ "کیا بات ہے بیٹے۔ کیوں چیخ رہے ہو؟" "امی جی" دیکھیں..... دیکھیں آج میں پورے کلاس و اسکول میں "اول نمبر" آیا ہوں۔ آج میں نے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ ڈالے ہیں۔ اور۔ اور۔ وہ جلدی جلدی بتانے لگا۔ پرنسپل صاحب نے تو میرے ماہانہ وظیفے کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ امی جی۔ امی جی۔ اب تو میں "ایئر فورس میں با آسانی ہو جاؤں گا نا؟" اس نے امی سے پوچھا تو انھوں نے پیار میں ذیشان کی پیشانی چوم لی۔ "انشاء اللہ میرے بیٹے۔ انشاء اللہ۔"

ذیشان کی امی مسز ثاقب ایک بیوہ تھیں۔ ان کے شوہر "ثاقب سعیدی" ایئر فورس میں "اسکوارن لیڈر" تھے مگر ایک جنگی مشق کے دوران جب وہ نوزائیدہ پائلٹ کو تربیت دے رہے تھے ان کا جہاز حادثے کی نظر ہوگیا تھا۔ مسٹر "ثاقب سعیدی" کا بیٹا "ذیشان ثاقب" اس وقت صرف چھ ماہ کا تھا، مسز ثاقب نے اپنے بیٹے کو ماں اور باپ بن کر پالا تھا۔ اسکی تربیت اس قدر بہتر طریقے سے ہوئی کہ بچپن سے اب تک وہ اپنی جماعت میں اول یا دوئم آتا تھا۔ مسز ثاقب کا یہ ارمان تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو شوہر کی وصیت کے مطابق پائلٹ

بنائیں۔ تاکہ وہ اپنے وطن پاکستان کا دفاع کر سکے۔
اب یہ خواب حقیقت میں بدل گیا۔ ثاقب سعیدی کا بیٹا:۔ "ذیشان سعیدی" پائلٹ آفیسر بن چکا تھا، ایک دن اس نے یہ خوشخبری اپنی ماں کو سنائی کہ اب اسے جنگ پر بھیجا جارہا ہے۔ مگر نہ جانے ماں یہ خوشخبری سن کر چپکے سے رو دی۔ دن گزرتے گئے ایک شام کو جب ذیشان کی والدہ "نماز کے بعد "تسبیح" پڑھ رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ ڈاکیہ تھا۔ جو لفافے میں ذیشان سعیدی" کی موت کا پیغام لایا تھا، ایک ایسی موت کا پیغام کہ جس پر زندگی بھی کر شک رتی ہے۔

مسز "ثاقب سعیدی" کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر انھوں نے فوراً انہیں پونچھ ڈالا۔ کیونکہ اب انہیں زندہ رہنا تھا۔ انہیں زندہ رہنا تھا اپنے "پوتے" کے لئے۔ "ذیشان سعیدی" کے بیٹے "سلمان سعیدی" کے لئے۔

واپسی

حماد مشتاق خاکی

نواز ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کبھی گھر واپس نہ آئے گا۔ آج ذرا سی غلطی پر اس کے باپ نے اسے بہت مارا تھا۔ وہ غصے میں باپ کی قمیص سے روپے چرا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ پگڈنڈی پر تیز تیز قدم اٹھاتا وہ لاری کے اڈے تک پہنچ گیا۔ لاری پہلے سے ہی موجود تھی اور شہر جانے کے لئے تیار تھی۔ نواز نے ایک مرتبہ مڑ کر دور گاؤں کی طرف دیکھا اور سر جھٹک کر لاری میں سوار ہو گیا۔ لاری کا کرایہ ادا کرنے کے بعد اس کے پاس کوئی پیسہ نہ بچا دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ شہر پہنچ گیا۔ شام کے سائے پھیل چکے تھے اسے بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے مختلف دکانوں کے سامنے سے گزر رہا تھا اتنے میں اسے ایک تندور نظر آیا۔ ایک ضعیف العمر شخص گرما گرم نان تندور سے نکال رہا تھا۔ نواز کی بھوک چمک اٹھی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تندور کی جانب کھچا چلا گیا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ ایک نان مانگ لوں مگر پھر اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑا تندور کی جانب دیکھنے لگا جب سب لوگ تندور سے چلے گئے تو بوڑھے نے اشارے سے نواز کو اپنی طرف بلایا۔ نواز آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کے قریب آگیا۔

"بھوک لگی ہے بیٹا۔؟" اس نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جی۔ جی بابا" نواز ہکلایا۔

"آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ" بابا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھالیا۔ "تم کہاں سے آئے ہو؟" اس نے نان اور دال کی پلیٹ نواز کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ تنور کے ایک طرف ایک شخص پڑا ہوا تھا اس کی دونوں ٹانگیں کٹی ہوئیں تھیں نواز بغور اسے دیکھ رہا تھا وہ چپ چاپ ٹکٹکی باندھے سامنے کی دیوار کو دیکھ رہا تھا "یہ کون ہے بابا؟" نواز ہمت کر کے بولا۔

"یہ۔ بیٹا اس کی کہانی بہت طویل ہے۔ تم کھانا کھالو پھر تم سے باتیں ہوں گی" بابا مسکرایا۔ نواز نے

جلدی جلدی کھانا کھایا۔ بابا نے کونے میں بیٹھے ہوئے شخص کو بھی کھانا دیا اور وہ بھی دھیرے دھیرے کھانا کھانے لگا۔

"بیٹا تم نے بتایا نہیں..... تم کہاں سے آئے ہو؟" بابا نے پیار سے نواز کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بابا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں" نواز نے صاف جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا۔ تم میرے پاس رہو۔ تم مجھے اپنا ہی باپ سمجھو" بابا بولا

"بابا۔ کیا یہ آپ کا بیٹا ہے" نواز نے پھر اسی شخص کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں بیٹا..... یہ چھوٹا سا تھا جب ایک دن یہ گھر سے بھاگ گیا..... پھر اسے کچھ لوگ پکڑ کر لے گئے انہوں نے اس سے چوریاں کروائیں ڈاکے ڈلوائے اور اسے ایک بڑا ڈاکو بنا دیا۔ اس نے سینکڑوں لوگوں کو لوٹا..... مگر ایک دن پولیس اس کے پیچھے لگ گئی۔ اور پھر پولیس مقابلے میں اس کی دونوں ٹانگوں میں گولیاں لگیں۔ ڈاکٹر پوری کوشش کے باوجود اس کی ٹانگوں کہ نہ بچا سکے۔ اور بالاخر انہیں اس کی ٹانگیں کاٹنا پڑیں۔"

"اف خدا..... تو پھر کیا یہ اپنے گھر نہیں گیا؟" نواز بولا اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے "نہیں بیٹا اب اس کی سزا معاف ہو گئی ہے مگر یہ اپنے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے ترس کھا کر اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اب بھی کبھی کبھی یہ روتا ہے اور کہتا ہے کہ کاش میں گھر سے نہ بھاگا ہوتا تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی" بابا نے کہا اور نواز کی جانب دیکھا۔ نواز اسے دیکھتے جا رہا تھا وہ کبھی اس کی کٹی ہوئی ٹانگوں اور کبھی اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو بیٹا" بابا نے دریافت کیا۔

"بابا۔ کیا تم مجھے کچھ روپے دے سکتے ہو" نواز بولا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خواب میں بول رہا ہو وہ اب بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ لیکن تم ان کا کرو گے کیا" بابا حیرت بھرے لہجے میں بولا "بابا مجھے واپسی کا کرایہ چاہئے..... اماں اور ابا میری راہ تک رہے ہوں گے..... جلدی کیجئے ایسا نہ ہو کہ میرے لئے بھی واپسی کے راستے بند ہو جائیں۔" نواز بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ بابا اب بھی حیرت سے اس کا منہ تک رہا تھا۔

آنکھ مچولی

محمد عثمان منگلا ڈیم

جو گھر لایا آنکھ مچولی
بھر لایا خوشیوں سے جھولی
اس کو پڑھ کر خوش ہوتے ہیں
میرے سارے ہی ہم جولی
اس کو مرتب کرنے والی
ہے اچھے لوگوں کی ٹولی
ہر اک اچھی بات جہاں کی
اپنے اندر اس نے سمولی
ہے عثمان کی آنکھ کا تارا
پیارا پیارا آنکھ مچولی

رہزن یا محافظ

محمد شہلد۔ کراچی

کچھ دنوں سے اس علاقہ میں ڈاکوؤں کا اتنا زور ہو گیا تھا کہ لوگ پریشان تھے۔ آج فلاں جگہ ڈاکہ پڑا، کل

مجید کے گھر حملہ ہوا۔ شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرا ہو جس میں کسی نہ کسی جگہ ڈاکہ پڑنے کی خبر نہ ملتی ہو۔ لوگوں کی پریشانی اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ پولیس اپنی بے انتہا کوششوں کے باوجود ابھی تک ڈاکوؤں کا کوئی سراغ نہیں لگا پائی تھی۔

ضلع کی انتظامیہ خود اپنی جگہ پریشان تھی۔ جس کے لئے یہ ایک چیلنج ہی تھا کہ پورے ضلع میں ڈاکو اپنی غیر قانونی حرکتوں اور ظلم وستم سے عوام کو پریشان کر رہے تھے اور قانون کے محافظ بے بس تھے۔ اخباروں میں پولیس اور ریاستی حکومت پر سخت تنقید ہو رہی تھی، تبصرے جاری تھے۔ صرف ایسا ہی نہیں تھا کہ ڈاکے صرف گھروں پر ہی پڑ رہے تھے بلکہ سڑکوں اور ہائی وے پر آنے جانے والی بسیں، موٹریں اور کاریں بھی محفوظ نہ تھیں۔ راتوں کی بات تو چھوڑیئے دن کی روشنی میں سڑک پر چلنے والی بسیں لوٹ لی جاتی تھیں اور پولیس ہمیشہ واردات کے بعد ہی وارد ہوتی تھی۔ وجہ بظاہر تو یہی تھی کہ پولیس کو بھی اپنی جان پیاری تھی۔

ندیم کو انتہائی ضروری کام تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس وقت بس سے سفر کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس کے دماغ میں ڈاکوؤں کی سرگرمیاں رقص کر رہی تھیں۔

اس کے ذہن پر ڈاکوؤں کا خوف بری طرح سوار تھا۔ وہ تصور کی دنیا میں واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ بس جا رہی ہے۔ اچانک جنگل میں ڈاکوؤں نے اسے روک لیا اور پھر فائرنگ ہوئی دو تین ڈاکو شان و شوکت کے ساتھ بس میں داخل ہوئے اور مسافروں سے ریوالور کی نوک پر نقدی وصول کرنے لگے۔

"کیا سوچ رہے ہو ندیم.....؟"

آصف کی آواز نے اسے تصور کی دنیا سے حقیقی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ "یہی کہ مجھے بس سے سفر نہیں کرنا چاہئے۔"

"مگر کیوں؟" آصف نے سوال کیا"

"کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ڈاکوؤں نے بس سے سفر کرنے والوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے؟ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو ہمارے پاس ہے ہی کیا"؟

"کچھ ہو نہ ہو ڈاکو ایسے موقع پر طیش میں آکر پٹائی بھی تو کر دیتے ہیں۔ بھئی زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔"

"بڑے بزدل ہو تم۔ بھئی ہمیں تو اس بس کے ذریعے ہی اپنی منزل پر پہنچنا ہے اور یہ بھی تو سوچو کہ کام کتنا ضروری ہے۔"

آخر کچھ سوچ کر دونوں دوستوں نے سفر کا ارادہ کیا بس اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ سفر کو شروع ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ رات کی تاریکی اپنے سائے پھیلا رہی تھی اور سڑک کے دونوں طرف اگی ہوئی جھاڑیاں بڑا خوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ بس اس

وقت اپنی پوری رفتار سے سفر کر رہی تھی۔
اچانک آگے کی سیٹ سے دو آدمی کھڑے ہوگئے اور ڈرائیور سے بولے ہمیں یہاں اترنا ہے بس روک دو۔

بس جیسے ہی رکی جھاڑیوں کے پیچھے سے تین چار افراد ہاتھوں میں بندوقیں لئے سڑک پر آگئے۔

ان میں سے ایک نے جو لحیم شحیم تھا آگے بڑھ کر کڑک دار آواز میں کہا، "کوئی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے، ہم ناحق خون بہانا پسند نہیں کرتے" اور پھر انہوں نے ایک ایک مسافر سے روپیہ اور قیمتی سامان لینا شروع کر دیا۔ ہر آدمی اپنی جگہ ڈرا سہما ہوا تھا اور خاموشی سے اپنا سامان ان کے حوالے کر رہا تھا۔

"ابے جلدی کر وقت زیادہ ہو رہا ہے" ان میں سے ایک نے جو شاید ان کا سردار تھا کہا۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے وہ ساری رقم استاد کے حوالے کر دی۔ استاد نے کچھ دیر کھڑے کھڑے اس رقم پر ایک نظر ڈالی اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ سردار نے اپنے آدمیوں سے کہا "صدیقے سب لوگوں کی رقم واپس کر دو" اور پھر استاد کے آدمیوں نے لوگوں کو ان کا سامان اور روپے واپس کر دیئے۔ ہر شخص اور خصوصاً ندیم بہت حیرت زدہ تھا کہ ڈاکوؤں میں یکایک کیا تبدیلی رونما ہوگئی، ایسا تو کبھی نہیں ہوا ہوگا کہ ڈاکوؤں نے رقم لوٹ کر واپس کر دی ہو۔ بہت سے لوگ اس راز کو جاننے کے خواہش مند تھے جن میں آصف اور ندیم بھی شامل تھے۔ آخر کار ایک بڑے میاں نے ڈرتے ڈرتے ڈاکوؤں کے سردار سے سوال کر ہی لیا کہ "اگر جان کی امان دیں تو استاد صاحب ایک بات بتا دیں"

"بکو!" استاد نے کہا "آپ نے رقم لوٹ کر واپس کیوں کر دی۔" استاد نے ایک طنزیہ مسکراہٹ بڑے میاں کی طرف اچھالی اور بولا "پولیس سے ہمارا معاہدہ ہے کہ ہر بس کے لوٹنے پر ہم انہیں پانچ ہزار روپے ادا کریں گے۔ تم لوگوں کی بس سے ہم نے جو رقم لوٹی ہے وہ کل تین ہزار دو سو روپے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں پولیس کو اٹھارہ سو روپے اپنی جیب سے دینے پڑتے۔ سو اس نقصان سے بچنے کے لئے ہم نے لوٹی ہوئی رقم واپس کر دی۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے یہ کہا اور پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ انجانی منزل کی جانب روانہ ہوگیا۔

بس کے تمام لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ ندیم سوچ رہا تھا کہ جب کسی قوم کے محافظ ہی رہزن بن جائیں تو وہ قوم زوال کی آخری حد تک کتنی جلدی پہنچتی ہے۔

امریکہ میں واقع ایک جگہ گیٹر لینڈ جس میں ۵ ہزار مگرمچھ پائے جاتے ہیں

میرا داتا سب کا داتا

منیر احمد فردوس ..... ڈیرہ اسماعیل خان

کالی گھٹائیں کون ہے لاتا ؟
ٹھنڈی ہوا ہے کون چلاتا ؟
دن اور رات ہے کون بناتا؟
میرا داتا سب کا داتا
کس کے ہیں یہ چاند ستارے؟
کس کے ہیں یہ گلشن سارے؟
ہے کون ہے جوان کو ہے سجاتا؟
میرا داتا سب کا داتا
چنچل ندیاں گہرے ساگر
کس کی شان بڑھائیں بہہ کر
کون سے جوان کو ہے بہانا
میرا داتا سب کا داتا
صبح کا نور اور شب کے سائے
سورج ڈوبے چندا آئے
ان کو وقت پہ کون ہے لاتا
میرا داتا سب کا داتا

"باز اور کوا"

اللہ جان۔ ٹنڈو محمد خان

ایک دن ایک فقیر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جارہا تھا۔ دونوں گاؤں کے درمیان میں ایک بڑا سا جنگل تھا۔ جس میں ہر قسم کے جانور اور پرندے تھے۔ فقیر جب گاؤں سے نکل کر جنگل میں داخل ہوا تو اسے راستے کے ایک طرف ندی کے کنارے ایک کمزور سا کوا نظر آیا۔ کوا نہ تو اپنی جگہ سے اڑ سکتا تھا اور نہ ہی ادھر ادھر چل پھر سکتا تھا۔ فقیر یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ کوا نہ تو اڑ سکتا ہے اور نہ چل پھر سکتا ہے پھر یہ کیسے زندہ رہا ہے۔ فقیر نے دل میں سوچا معلوم کرنا چاہئے کہ یہ کیا کھاتا ہے اور اسے خوراک کہاں سے آتی ہے۔ فقیر راستے سے ایک طرف درخت کے پیچھے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد دیکھتا کیا ہے کہ ایک باز پنجوں میں گوشت کا بڑا سا ٹکڑا لئے ہوئے کوئے کے قریب زمین پر بیٹھ کر گوشت کھانے لگا۔ کچھ گوشت کھا کر باز اڑ گیا۔ یہ دیکھتے ہی کوا گھسٹ گھسٹ کر گوشت کے ٹکڑے کے قریب آیا اور گوشت کھانے لگا۔ گوشت کھانے کے بعد کوا ندی کے قریب آیا اور خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ اور واپس اپنے جسم کو گھسیٹتا ہوا اپنی جگہ پر بیٹھ کر آرام کرنے لگا۔ فقیر یہ دیکھ کر دل میں کہنے لگا واقعی خدا تعالیٰ ہر کسی کو روزی دینے والا ہے۔ میں تو خواہ مخواہ گاؤں جاکر بھیک مانگتا ہوں اور تکلیفیں اٹھاتا ہوں کیوں نہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ جاؤں خدا تعالیٰ خود ہی مجھ تک رزق پہنچائے گا۔ یہ خیال آتے ہی فقیر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے ذریعے کھانا بھیج دے گا، صبح گزر گئی دوپہر گزر گئی سہ پہر بھی آئی اور چلی گئی مگر کھانا نہیں آیا۔ فقیر اسی طرح بھوکا لیٹا رہا۔ رات کا وقت آگیا تو فقیر کمبل اوڑھ کر سوگیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک بزرگ شخص اس کے پاس کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے "رزق حاصل کرنے کا طریقہ سیکھا ہے مگر میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کوے کو دیکھ کر تو تو نے اس سے سبق حاصل کر لیا مگر تو نے باز کو دیکھ کر اس سے کیوں سبق نہیں سیکھا۔ تُو تو باز سے بھی زیادہ طاقتور اور ہوشیار ہے۔ اٹھ اپنے آپ کو باز بنا اور کمزوروں اور محتاجوں کی مدد کر۔ خود بھی کھا اور اوروں کو بھی

کھلا۔ " فقیر اسی وقت نیند سے بیدار ہوا اور بوریا بستر لپیٹ کر چل پڑا اور محنت مزدوری شروع کر دی۔ اس کے بعد نہ تو اس نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ اور نہ ہی کسی سے کچھ مانگا۔ بلکہ باز بن کر اور انسانوں کی خدمت کرنا شروع کی۔

ذہنی آزمائش

مرسلہ۔ عارفہ ابرار۔ نئی کراچی

س:۔ ایک سے بیس تک وہ کونسا ہندسہ ہے جسے الٹا پڑھیں تو ایک پھل کا نام بن جاتا ہے؟

س:۔ بغیر نقطے کے جملہ کیا ہو سکتا ہے؟

س:۔ شوکت صاحب کی پانچ لڑکیاں ہیں اور ہر لڑکی کا ایک بھائی ہے۔ بتایئے شوکت صاحب کے کتنے بچے ہیں؟

س:۔ ذرا جملہ پڑھئے۔ کیلیکیگیلیجڑ۔

جوابات

(۱) بیس سے سیب (۲) جملہ (۳) پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ کل چھ بچے ہیں۔ (۵) کیلے کی گیلی جڑ۔

☆..... اقوال زریں .....☆

مرسلہ..... کاشف شہزاد

۱۔ جہل کی بات برداشت کرنا عقل کی زکوٰۃ ہے۔

۲۔ فتح ان کی قسمت میں ہوتی ہے جن کو اپنی فتح کا یقین ہے۔

۳۔ کلام میں نرمی اختیار کرو، لہجے کا اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔

۴۔ عظیم ہے وہ شخص جو نہ سردار بنے اور نہ سردار بنایا جائے مگر اسے سردار تسلیم کیا جائے۔

۵۔ تم جیسے ہو خود کو ویسے ہی ظاہر کرو ورنہ لوگ تمہاری اصلیت ظاہر کر دیں گے۔

عربوں کا ایٹم بم

ریحان احمد شیخ

ایٹم بم موجودہ زمانے کا نہایت خوفناک ہتھیار ہے۔ اسے صرف دو مرتبہ جاپان کے دو شہروں پر استعمال کیا گیا۔ جس سے ہزاروں آدمی ہلاک ہو گئے۔ کئی مربع میل زمین پر بربادی کی جھاڑو پھر گئی۔ پہلے زمانے میں بھی ایسی چیزیں موجود تھیں۔ ان سے متعلق بھی لوگوں کا وہی خیال تھا جو آج کل ایٹم بم کے متعلق ہے۔ ان میں وہ آتش گیر روغن خاص طور پر قابل ذکر ہے جو عربوں نے تیار کیا تھا اور صلیبی جنگوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اہل فرنگ نے اس کا نام "گریک فائر" یعنی "یونانی آگ" رکھا۔ شاید اس لئے کہ اس روغن سے آگ پکڑنے کا نظارہ پہلے پہل قسطنطنیہ میں انھوں نے دیکھا تھا اور قسطنطنیہ اس وقت یونانی شہر تھا۔

اس روغن کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا تھا۔ کبھی بڑی بڑی پچکاریوں میں بھر کر دور دور پھینکتے یا بھالوں اور تیروں کے پھلوں پر یہ روغن مل دیتے۔ ہوا لگتے ہی یہ بھالے اور تیر آگ پکڑ لیتے۔ کمان کی شکل کا ایک آلہ بنایا گیا تھا۔ جسے توپ کی طرح زمین میں نصب کر کے چلایا جاتا تھا۔ اس کی مار منجنیق سے بھی زیادہ تھی اس کے ذریعے سے روغن دور دور تک پھینکا جا سکتا تھا۔

تیروں کے ذریعے آتش بازی کا سلسلہ تو عربوں نے بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔ محمد بن قاسم نے سندھ کی جنگ میں ایسے تیر اندازوں سے کام لیا تھا جن کے تیر کمانوں سے نکلتے ہی سراپا آگ بن جاتے تھے۔ بعد ازاں آتش گیر روغن سے کام لینے کا فن بہت ترقی کر گیا۔ صلیبی جنگوں میں عربوں نے یہ روغن استعمال کیا تو اہل فرنگ پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ وہ اس قدر دہشت زدہ ہو گئے کہ اس آگ کو دیکھتے ہی پناہ کے لئے برجوں کے اندر گھس جاتے۔ لیکن آگ ایسی خوفناک ہوتی کہ برج بھی انہیں اس کی تپش سے بچانے میں ناکام ثابت ہوتے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آگ کو پانی سے فوراً بجھایا جا سکتا ہے لیکن اس آگ پر پانی ڈالا جاتا تو یہ اور بھڑکتی۔ یہ روغن مٹی کے تیل سے تیار کیا جاتا تھا لیکن اس میں کئی مسالے ایسے ملا دیئے جاتے تھے جس سے اس کی تیزی اور حرارت بے پناہ بن جاتی تھی۔

یہ روغن بری اور بحری دونوں قسموں کی لڑائیوں میں یکساں استعمال ہوتا تھا۔ عربوں نے اپنے جہازوں پر جا بجا بڑی بڑی پچکاریاں لگا رکھی تھیں جن میں سے کسی کی شکل اژدھے کی سی ہوتی، کسی کی شیر یا گھڑیال کی سی۔ دشمن کے جہازوں پر یہ روغن پڑتے ہی ان میں آگ لگ جاتی اور وہ جل کر راکھ ہو جاتے تھے۔ ہوا میں تیر یا روغن پھینکنے سے خط قوسی جیسی حرکت پیدا ہوتی تو ساتھ ہی روغن آگ پکڑ لیتا۔ پہلے ایک دھماکہ سا ہوتا پھر سیاہ دھواں نکلتا اس میں سے شعلے نمودار ہو جاتے۔ ایک یورپی مورخ نے لکھا ہے کہ یہ آگ رات کو برسائی جاتی تو سارا کیمپ روشن ہو جاتا۔ لوگ گھبرا گھبرا کر اوندھے منہ گر جاتے اور آستینوں سے سر چھپا لیتے آگ ہوا میں اڑتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ لمبی دم ہلانے والا پر دار اژدھا اڑا چلا جا رہا ہے۔ رعد کی کڑک اور بجلی کی چمک دونوں چیزیں اس میں موجود ہوتیں۔ یہ آج سے سات آٹھ سو سال پیشتر کا ایٹم بم تھا جو عربوں نے ایجاد کیا تھا۔

اس کے بعد سائنس نے دوسری خوفناک چیزوں کی ایجاد شروع کر دی۔ اب کسی کو "یونانی آگ" کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ حالانکہ چھ سات سو سال پیشتر تک یہ آگ لڑائیوں میں سب سے بڑھ کر تباہی خیز سمجھی جاتی تھی۔ حق یہ ہے کہ ایجاد وہی قابل قدر ہے جس سے انسانوں کو فائدہ پہنچے۔ اس ایجاد کو کون اچھا سمجھ سکتا ہے جو بڑی بڑی آبادیوں کو پلک جھپکتے میں روئے زمین سے مٹا ڈالے۔

منتظر رہیے

۱..... زیادہ کھانے والا بیماری کا۔

۲..... اوباش دوستوں والا بربادی کا۔

۳..... چغل خوری کرنے والا ذلت و خواری کا۔

۴..... ماں باپ کا نافرمان اپنی اولاد کی نافرمانی اور مفلسی کا۔

۵..... ظلم کرنے والا اپنی ہلاکت کا۔

۶..... پڑوسی کو تکلیف دینے والا جلد خدا کے قہر و غضب کا۔

۷..... زیادہ اور بیہودہ کلام کرنے والا مصائب و آلام کا۔

مرسلہ۔ (محمد سلیم انجم ..... رحیم یار خان)

جنوری ۱۹۹۰ء کے "خوفناک نمبر" میں شائع ہونے والی تحریر "ایک خواب جس نے دنیا کو ہلا دیا" نقل شدہ تھی اس تحریر کے بھیجنے والے خالد خلیل کو بلیک کیس کیا جاتا ہے۔ ثبوت فراہم کرنے پر ادارہ زاہدہ خیر محمد منزل حیدر آباد کا ممنون ہے۔ (ادارہ)

روشن مثال

ان ساتھیوں کا تعارف

جنہوں نے کسی بھی شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو

The Pick of The month

اورنگزیب بلوچ

میٹرک میں اے گریڈ

۱۶ سال، ایف ایس سی
ٹکٹ جمع کرنا، کرکٹ، شطرنج کھیلنا
حساب، ڈاؤس، سیوتھی
روڈ، کچھ، ضلع سانگھڑ۔

نوید عباس

گیارھویں اسکاؤٹ جمبوری میں تیسری پوزیشن

۱۴ سال، دسویں، کرکٹ
کھیلنا، کتابیں، ٹکٹ جمع کرنا
ریاضی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول
سجاول ضلع ٹھٹھہ، سندھ۔

محسن خان بالاچ

پہلی سے دسویں تک فرسٹ پوزیشن

۱۴ سال، دہم، کرکٹ
کھیلنا، قلمی دوستی کرنا، بائیالوجی
گورنمنٹ ہائی اسکول تربت
مکران، بلوچستان۔

محمد عارف علی بھٹی

ٹنڈو ورزمیٹرک میں اے گریڈ

۱۵ سال • میٹرک • خطوط لکھنا
دوستی کرنا • اسلامیات
محمد عارف علی بھٹی۔ مکان نمبر ۱، اے ۱۳،
محلہ سرہیہ، محمد سندھ ضلع نوشہرو فیروز۔

فہیم احمد

اول تا پنجم فرسٹ پوزیشن

۱۱ سال • ہشتم • کرکٹ کھیلنا،
آنکھ مچولی پڑھنا • سائنس
مکان نمبر ۵۰۲ بی چاندنی چوک
ماتلی • ضلع بدین۔

مرزا محسن بیگ

فرسٹ پوزیشن ان سپیلنگ بی کمپیٹیشن

۱۸ سال • بارھویں • ڈاکٹر
مطالعہ، کھیلوں کے ریکارڈ جمع کرنا۔
۳۲۸/۹۔ ایف۔
لطیف آباد۔ حیدر آباد

سید فراز محمود

سلوٹ کوئز میں اول پوزیشن

آٹھ سال • تیسری • ڈاکٹر
کرکٹ اور فٹبال کھیلنا • اردو
اے۔ ۵۰۰ بلاک ڈی
نارتھ ناظم آباد • کراچی۔

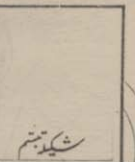

شکیلہ تبسم

گرل گائیڈز میں میڈل اچھی کہانیوں پر انعام

۱۲ سال • ہشتم • ٹکٹیں
اور ماچسیں جمع کرنا، کہانیاں
لکھنا، وغیرہ۔
حافظ آباد۔

سید سہیل علی

اول تا ششم اول پوزیشن

۱۱ سال • ساتویں ٹکٹ اکٹھے
جمع کرنا، باغبانی • سائنس حساب
۵۵۲/۱۸ • فیڈرل بی ایریا
شریف آباد • کراچی۔

محمد شہریار

سیرت النبی کوئز میں پہلی پوزیشن

۱۴ سال • دہم • مطالعہ
قلمی دوستی اور مصوری • حساب •
ایل ۵۴ بلاک ۱۵ گلشن مصطفٰے
فیڈرل بی ایریا • کراچی نمبر ۳۸۔

آپ کی تصویر اس فریم
کے سائز میں کٹی ہوئی
ہونی چاہیئے۔ چھوٹی یا
بڑی تصویر قابلِ قبول
نہ ہوگی

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی کے مختلف مقابلوں یا تحریری سلسلوں میں شرکت کے لئے جابجا کوپن پھاڑنے سے رسالے کے بدنما ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے تمام کوپن اس صفحے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____ کلاس _____ عمر _____

ارسال کردہ کل رقم _____ بذریعہ _____ دستخط _____

پتا _____

_____

غزل پزل میں شرکت کا کوپن

نام _____ عمر _____ کلاس _____

پتا _____

جواب نمبر ① _____ ② _____ ③ _____ ④ _____ ⑤ _____

⑥ _____ ⑦ _____ ⑧ _____ ⑨ _____ ⑩ _____

نام _____ عمر _____ جماعت _____

مشاغل _____ پسندیدہ مضمون _____

کوئی اہم کامیابی _____

پتہ _____

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں۔ ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون:- ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون:- ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون:- ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون:- ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون:- ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون:- ۰۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون:- ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان فون:- ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار پشاور فون:- ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار وہاڑی
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس ملتان فون:- ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد فون:- ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
سعید بک اسٹال۔ گجرات فون:- ۰۴۳۳۱	مسلم بک ڈپو۔ سرائے عالمگیر
سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون:- ۲۴۱۴	
یونائیٹڈ بک ایجنسی۔ سکھر	ایم۔ ایم ٹریڈرز۔ کوئٹہ

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینیجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۳، نورس روڈ، سائٹ، کراچی ۱۶

کیا آپ نے بھی کوئی روشن مثال قائم کی ہے؟

اس تعارفی سلسلے میں صرف وہی ساتھی شریک سکیں گے جنہوں نے کسی بھی شعبے میں کوئی نمایاں کام یا اہم کامیابی حاصل کی ہو شلاً۔ امتحان میں پوزیشن، مختلف نوعیت کے مقابلوں میں کامیابی، کوئی اہم سماجی کام، کوئی اور کارنامہ......

○ ...... اپنی کامیابی کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے ضرور کروائیں ورنہ تعارف شائع نہ ہوسکے گا۔

○ ...... آپ کی تصویر ایک خاص سائز میں مطلوب ہوگی۔ سائز کے لئے ایک فریم شائع کیا جارہا ہے۔ تصویر اس سائز سے بڑی ہو نہ چھوٹی۔ تصویر صاف کٹی ہوئی ہو ورنہ کسی طور شائع نہ ہوسکے گی۔

> یاد رہے ! ہر ماہ شائع ہونے والے تعارف میں سے بہترین اور زیادہ باصلاحیت ساتھی کو (BESTOFMONTH) کا خطاب دیا جائے گا اور اس کا تعارف ٹیلی ویژن سمیت مختلف اداروں کو بھجوایا جائے گا تا کہ اس کی صلاحیتوں کو قومی سطح پر متعارف کروایا جاسکے۔

○ ...... پرائمری سے بارہویں تک کے طلباء وطالبات اس میں شریک ہوسکتے ہیں مگر طالبات کے پتے شائع نہیں کئے جائیں گے۔ ○ ...... کوپن کا آنا شرط ہے جو صفحہ نمبر ۱۳۵ پر موجود ہے۔

خالد اسماعیل

امّی ابّو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی

اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

ہمارے بیشتر مسائل اپنے ہی تخلیق کردہ ہوتے ہیں اور جب یہ مسائل اپنی تمام تر سنگینی اور شدّت کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہوتے ہوئے ہماری معاشی، سماجی اور بالخصوص ہماری گھریلو زندگی کو متاثر کرنے لگتے ہیں تو یا تو ہم بدحواس ہو کر مسئلے کو ہی کوسنے لگتے ہیں یا پھر ان لوگوں اور حالات کو کوسنے لگتے ہیں جو ہمارے لئے مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم محض مسئلے کے منطقی نتیجے کو دیکھتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ آخر وہ کونسی وجوہات ہیں جنہوں نے مسئلے کو جنم دیا اور جس کی وجہ سے ناپسندیدہ نتائج بر آمد ہوئے۔

اس تمہید کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ اگر آپ کا بچہ ضدی، بدتمیز اور بدمزاج ہے تو اس میں قصور بچے کا نہیں بلکہ آپ کا ہے کیوں کہ وہ ابھی تک عمر کے اس حصّے میں ہے جہاں وہ اپنی تمام تر سوچ اور افعال کا تعیّن ان حالات کے مطابق کرتا ہے جو آپ اسے فراہم کرتے ہیں۔

عام طور پر ہمارے یہاں ہوتا یہ ہے کہ جب بچہ بدتمیزی کرتا ہے یا اپنی ضد پر اڑا رہتا ہے تو بجائے یہ سوچنے کے کہ آخر اس نے یہ منفی رویّہ کیوں اختیار کیا، ہم یہ کہہ کر صاف بچ نکلتے ہیں کہ بچہ بدتمیز یا ضدی ہے یوں ہم اپنی غفلت کی تمام تر ذمہ داری بچّے کے سر پر رکھ کر خود بَری الذّمہ ہو جاتے ہیں۔

بعض اوقات بچے کو اس کے قصور پر ڈرایا دھمکایا یا مارا پیٹا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچّہ خوف کے مارے وقتی طور پر سہم کر خاموش ہو جاتا ہے اور ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہ اس نے ہماری بات مان لی اور آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔ لیکن یہ مسئلے کا مستقل حل نہیں ہے بلکہ اس سے مزید الجھاؤ پیدا ہوگا۔

یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ بچہ بدتمیز اور چڑچڑا ہے۔ لہٰذا اسے راہ راست پر لانے کے لئے بار بار کی ڈانٹ ڈپٹ اور مار دھاڑ سود مند ثابت نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں ہمیں کوئی مستقل حل ڈھونڈنا چاہئے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ آخر وہ کونسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے بچے کی شخصیت کے منفی پہلو مثبت پہلوؤں پر غالب ہیں۔ اس عمل سے ہم پر واضح ہوگا۔ کہ دراصل ہم نے ہی اسے ایسے حالات و محرکات فراہم کئے ہیں جن کے نتیجے کے طور پر اس کی شخصیت پر منفی رنگ غالب ہو گیا ہے لہٰذا ان مسائل کے مستقل حل کے لئے ہمیں ایسے طریقے اختیار کرنا چاہئیں جو مؤثر ہونے کے ساتھ ساتھ بچے کے لئے قابل قبول ہی ہو۔ اب ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ آئندہ ایسے حالات ہی پیدا نہ ہونے دیئے جائیں جن کے اثرات ناخوشگوار ہوں دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان عوامل اور محرکات ہی کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیا جائے جن کی وجہ سے مسائل جنم لے رہے تھے۔ یاد رہے کہ بچے کا آج کا رویہ اور سوچ اس کے کل کے تقریباً تمام رویوں اور سوچ کا آئینہ دار ہے۔

Every Morning
Every Night
Keep Them Healthy
Keep Them White
ACTION
JUNIOR TOOTHBRUSH
Begin your day with
ACTION...
.... and what a day it would be.
A day full of smiles, laughter
and ofcourse –healthy
gums and clean teeth.
Now
also available
at all Utility
Stores.
UNIVERSAL BRUSHWARES (PVT) LTD.

REGD. No. M-266 NOVEMBER 1990

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI